مخدوم محی الدینؒ

بساطِ رقص

ناشر
اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

بساطِ رقص

مخدوم محی الدّین

ناشر
اردو اکیڈمی آندھرا پردیش۔ حیدرآباد

تیسرا ایڈیشن

تعداد اشاعت : ایک ہزار

سنِ اشاعت : 1986ء

سرورق و کتابت : محمود سلیم

طباعت : ڈی لکس پرنٹرس۔ زیبا باغ، آصف نگر حیدرآباد

اعجاز پرنٹنگ پریس ۔ چھتہ بازار حیدرآباد

قیمت فی جلد : 25 روپے

ناشر و تقسیم کار :

اردو اکیڈمی آندھرا پردیش

637-4-11 اے ۔ سی ۔ گارڈ، حیدرآباد۔500004۔

فون نمبر : 33801

مُحبّت اور محنَت

کے نام

مخدوم محی الدین ایم۔اے (عثمانیہ)

مقام پیدائش : مستقر سنگاریڈی ضلع میدک۔ آندھرا پردیش۔

تاریخ پیدائش : فروری ۱۹۰۸ء

تاریخ وفات : ۲۵۔ اگست ۱۹۶۹ء

تصانیف :

"سرخ سویرا" (شاعری)

"گل تر" (شاعری)

"بساطِ رقص" (شاعری) تین ایڈیشن

"ٹیگور اور ان کی شاعری"

(نثر)

"بھی کے پیچھے چھوکرا" (مضامین کا مجموعہ)

"ہوش کے ناخن"

(ڈراما)

فہرست

(بساطِ رقص)

طبعِ ثالث

اُردو کے بلند قامت اور مایۂ ناز شاعر اور قومی تحریکِ آزادی کے مخلص کارکن و رہنما مخدوم محی الدین کے مکمل کلام پر مشتمل "بساطِ رقص" کا تیسرا ایڈیشن نذرِ قارئین ہے۔

مخدوم کے سانحۂ رحلت کے سات سال بعد ادبی ٹرسٹ حیدرآباد نے "بساطِ رقص" کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا جس میں اُن کی وہ شاعری بھی شامل کی گئی جو "بساطِ رقص" کی پہلی اشاعت کے بعد سے اُن کی زندگی کی آخری سانس تک سات سال کی مدّت میں منظرِ عام پر آئی۔ اس طرح "بساطِ رقص" کا دوسرا ایڈیشن مخدوم کی پوری شعری تخلیقات پر حاوی تھا۔ "بساطِ رقص" کا دوسرا ایڈیشن بھی پہلے ایڈیشن کی طرح ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا۔ پچھلے کئی سال سے "بساطِ رقص" کا ایک نسخہ بھی کسی کتب فروش کے ہاں دستیاب نہیں تھا۔ اسی کمی اور خلاء کو پُر کرنے کے لیے، اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش نے "بساطِ رقص" کے تیسرے ایڈیشن کی اشاعت کا بیڑا اُٹھایا۔ اور بحمدللہ آج

اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والا یہ ایڈیشن آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ اُردو اکیڈمی مخدومؔ کے فرزندِ اکبر جناب نصرت محی الدین کی شکرگزار ہے کہ موصوف نے تیسرے ایڈیشن کی اشاعت کا حق اکیڈمی کو مرحمت فرمایا۔
زیرِ نظر ایڈیشن کی کتابت، طباعت اور تزئین و تدوین کو زیادہ سے زیادہ دیدہ زیب اور دلکش بنانے میں اکیڈمی نے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا ہے۔

اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش کو اس عظیم فن کار اور باشعور سیاست داں کی مکمل شاعری کے مجموعہ "بساطِ رقص" کا تیسرا ایڈیشن پیش کرتے ہوئے جس کی مانگ نہ صرف اقطاعِ ہند بلکہ بیرونِ ملک کے مختلف ادبی گوشوں سے روز بہ روز بڑھتی جارہی تھی۔ خوشی بھی ہے اور اُسے طمانیت کا یہ احساس بھی ہے کہ اکیڈمی نے مخدومؔ کی یاد میں ایک بہت ہی مناسب اور موزوں قدم اُٹھایا ہے۔ اِس توقع کے ساتھ کہ قارئین اِس پیش کش کو اپنی پسند سے نوازیں گے۔

محمد خلیل الرحمٰن
ام۔ اے۔ ال ال۔ بی
ڈائرکٹر سکریٹری
اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش

حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

زینت ساجدہ

من ترا حاجی بگویم

واقعہ ایک دن کا یہ ہے کہ میر حسن نامی ایک شخص اردو ہال کے اسٹیج پر صدر بنا تھا۔ کسی شاعر مرحوم کا یوم منایا جارہا تھا۔ اور تقریروں میں مرحوم کے اوصاف پسندیدہ کے گُن گائے جارہے تھے۔ ایسی عمدہ عمدہ بے شمار باتیں لوگوں نے کہیں کہ اگر بے چارہ مرحوم زندگی میں سُن پاتا تو پھولے نہ سماتا، زمانہ کی کج ادائی کا شکوہ نہ کرتا بلکہ اس کا بھی امکان تھا کہ وہ سُن لیتا کہ لوگ اسے اس قدر اچھا سمجھتے ہیں تو سچ مچ اچھا بن جاتا۔ بس خیال ہوا میر حسن کو کہ اگر زندگی میں ایسی قصیدہ خوانی کی جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ مارے خوشی کے عمرِ عزیز کے پانچ سات سال اور بڑھ جائیں۔ پھر اس کا بھی کیا بھروسہ کہ ہم جس طرح گزرے ہوؤں کو یاد کرتے ہیں لوگ، ہمیں بھی یاد کریں۔ پُرانے بادشاہ اسی بے اعتباری کے سبب اپنا مقبرہ جیتے جی ہی تیار کروالیتے تھے۔ چنانچہ شخص مذکور نے حلقۂ احباب میں یہ بات چھیڑی کہ اس طرح ایک دوسرے کی تعریف و تحسین کی جائے، باقاعدہ ایک پروگرام بنے اور آپس میں سب ایک دوسرے کو بھلا کہیں، اور سُنیں قرعۂ فال مخدوم کے نام نکلا، کیونکہ اس کمبخت کے چاہنے والے اس شہر میں بے حساب و بے شمار ہیں۔ ڈاڑھی والوں سے لے کر چوٹی والوں تک ہر طبقے اور ہر گوشے میں پائے جاتے ہیں۔ ہم نے اس سلسلہ کا نام رکھنا چاہا "من ترا حاجی بگویم"۔

حضرات، چوں کہ مخدوم کے چاہنے والے بیرونِ شہر و دیگر اقطاعِ ہند میں بھی پائے جاتے ہیں، اس لیے خیال ہوا کہ سب کو شرکت کا موقع دیا جائے۔ کیونکہ سب کی آرزو یہی تھی۔ اس لیے سلسلہ زلف کی طرح دراز ہوا۔ اور خدا معلوم کب وہ روزِ نیک آتا کہ اچانک رمضان شریف آپہونچے۔ اور اس کے بعد مخدوم اپنے ساٹھ سال پورے کرلیا۔ اس لیے جشن کا اعلان ہوا۔ مخدوم نہ اپنے آپ کو بوڑھا سمجھتا ہے نہ لوگ سمجھنا چاہتے ہیں تو اس

لیے عین اس کی جوانی میں اُس کا جشن منانا طے پایا۔ کچھ لوگ ایسے بھولے بھالے ہیں جو بڑی خوشی سے ذکر کرتے ہیں اور مبارکباد دیتے ہیں کہ لیجئے مبارک ہو۔ مخدومؔ ساٹھ سال کا ہوگیا، سُنا آپ نے ہاں حیرت ہے۔ مگر سچ مانئے یہ سُن سُن کر مخدومؔ کے دل پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ خدا جانے کب سے اُس نے یہ ٹرِک کر رکھی ہے کہ اس کی عمر کا پہیہ اُلٹا گھوم رہا ہے ہاں کبھی کبھی کوئی خاتون محترم اپنی جوان جہان بچّی کو اس سے ملاتے وقت کہتی ہیں ——

بٹیا، ملو، یہ ہمارے ابّا کے کلاس میٹ تھے یا کوئی مردِ بزرگ جن کے بالوں میں چاندی جِھلملا رہی ہے بڑے خضوع و خشوع سے ہاتھ ملا کر کہتے ہیں آپ نے پہچانا نہیں۔ میں سٹی کالج میں آپ کا طالب علم رہ چکا ہوں تو بے چارے مخدومؔ کی عجیب حالت ہوتی ہے، کیونکہ جب بھی لڑکیاں گروہ در گروہ سامنے سے گزریں تو مخدومؔ بش شرٹ کا کالر ٹھیک کر لیتا ہے کیوں کہ اس معصوم کو ابھی تک یہی خیال ہے کہ وہ سب اسے ہی دیکھ رہی ہیں۔ بات اسے دیکھ کر اِتنی عجیب نہیں معلوم ہوتی۔ خدا معلوم اس نے اور اُس کے ساتھیوں نے مصری ممیّوں کا کون سا نسخہ استعمال کیا تھا کہ برسوں سے اسے دیکھ رہے ہیں اور جوں کا توں سدا بہار، میرا خیال ہے کہ ریفریجریٹر اور تھرماس بنانے والی کمپنیاں مخدومؔ کو بطورِ اِشتہار استعمال کر سکتی ہیں۔ چونکہ یہ نسخہ میں نے سمجھائی ہے، فِفٹی فِفٹی نہ سہی (۱۵) فیصد رائلٹی کی حقدار ہوں۔

ہر ایک شخص جشنِ مخدومؔ میں اس کی قصیدہ خوانی پہ تُلا ہوا ہے، سن سن کر جی جلا اور جل بھن کر کباب ہو گیا، کیوں نہ جلے، ویسے بھی مخدومؔ سے جی جلتا ہے۔ مغلپورہ کے نوابوں سے لے کر حیکڑ پلی کے مزدوروں تک جس کو دیکھئے فیشن سا بنا لیا ہے کہ مخدومؔ کی محبت میں مرے جا رہے ہیں۔ سال بھر میں وہ ایک ہی غزل یا نظم کیوں نہ کہے، سارا شہر اسے منہ زبانی یکّا یکی یاد کر لیتا ہے۔ حیدرآبادیوں کی تو خیر مخدومؔ کمزوری بن گیا ہے۔ افیون کی طرح وہ اس کے عادی ہو گئے ہیں، مگر نووارد آندھرا کے نوسیکھ بھی لہرا لہرا کر "منڈیلی کے چنبو سے تلے" گنگناتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اُردو سیکھ گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں نے اس کا دماغ اور بھی خراب کر دیا ہے۔ ایک تو شاعر ہے ویسے ہی اتراتا ہے، پھر ان تعریفوں نے تو ناس ہی مار دیا اس کا کریلا نیم چڑھا بن گیا۔ اسی لیے میرا جی چاہتا

ہے سب تعریف کریں تو میں ہجو گوئی پہ اُتر آؤں تاکہ اینٹی ڈوٹ کا کام کرے، گھر میں بھی اس کی مخالفت مشکل ہے، چاہنے والے ہر گھر میں موجود ہیں۔ اس لیے یہاں زیادہ محفوظ ہوں کیونکہ اسٹیج پہ ایک نہیں کئی صدور تشریف فرما ہیں۔ جان و مال کی حفاظت کی ضمانت ہیں۔

مخدوم اصل میں سخت کمینہ ہے۔ دیکھئے کئی سال ہوئے میں نے اُس سے کہا تھا کہ ایک غزل لکھ دے تاکہ میں مشاعرہ میں پڑھ کر داد حاصل کرسکوں، آپ کو تو معلوم ہی ہے شاعروں پہ واہ واہ، سبحان اللہ، مکرر ارشاد، تعریف و تحسین کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں، تو پھر جی للچا ہی اُٹھتا ہے۔ مخدوم نے فوراً حامی بھرلی کہ تازہ کلام مجھے دیدیگا لیکن حال یہ ہے کہ شعر کا لفظ لفظ جس طرح وارد ہوتا ہے لوگوں کو سُنانے لگتا ہے پاؤ مصرعہ، آدھا مصرعہ، پون شعر اور پورا شعر، ہر منزل پہ سُناتا جاتا ہے۔ اطراف لوگ نظر نہ آئیں تو فون پر سُنائے گا۔ فون پہ کوئی سُننے والا نہ ملے تو لوگوں کے گھر جائے گا روپیہ رہن رکھا کر رکشا کا کرایہ چونی وصول کرلے گا۔ پھر روپیہ بھی ہضم کرجائے گا اور شعر سُنائے گا۔ اگر کوئی ڈھنگ کا سننے والا نہ ملے تو راستہ چلتے آدمی کو روک کر سُنائے گا بلکہ اُسے دیکھ کر آدمی خود سُننے رُک جائے گا۔ کوئی نہیں تو رکشا والے کو سُنائے گا، ہوٹل کے بیرے کو سُنائے گا، ننھے مُنے بچوں کو سنائے گا۔ غرض وہ اسی طرح غزل یا نظم کے تمام ہونے سے پہلے ہر لفظ کئی بار سیکڑوں لوگوں کو سُنا چکتا ہے۔ اس کا کلام مرض متعدی ہے سننے والے دوسروں کو سنائیں گے اس طرح حیدرآباد کی ساری پبلک طوطے کی طرح اس کا کلام رٹ لیتی ہے۔ اس طرح تازہ غزل مجھ تک پہونچنے سے پہلے سب کو زبانی یاد ہوجاتی ہے۔ پھر آپ ہی بتایئے کمینہ نہ کہوں تو اُسے کیا کہوں۔ میر کے کلام سے سرقہ کرنا آسان ہے، ممکن ہے کسی کو پتہ نہ چلے۔ لیکن مخدوم کا آدھا شعر بھی چوری کرلیجئے اور کسی کو سُنایئے تو سننے والا بقیہ آدھا شعر سُنا کر کہتا ہے "مخدوم نے کیا خوب کہا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو والے خواہ مخواہ اس کا کلام نشر کرنے سے بچتے ہیں۔ اس کا کیا بگاڑ لیتے ہیں، خود ہی بدنام ہوتے ہیں، وہ بذاتِ خود ریڈیو اسٹیشن ہے اور بار بار اپنے پروگرام اس طرح نشر کرتا ہے کہ دُور نزدیک سب نہ صرف سُن لیں بلکہ

سن سن کر یاد رکھنے پر مجبور ہو جائیں اور جب کسی محفل میں سنانے کی فرمائش ہو تو وہ بجد بننے کی کوشش کرے گا۔ کبھی یاد نہیں پبلک کے بے حد اصرار پر سناتے سناتے اٹک جائیگا۔ اور پبلک ایک آواز ہو کر جب اسے یاد دلائے گی تو اصیل مرغ کی طرح اکڑ کر اِدھر اُدھر نخریہ دیکھے گا۔ دیکھا آپ نے شاعری اس کو کہتے ہیں اور دوسرے شاعر بیچارے غمزدہ ہو کر اپنی ناقدری کا غم بھلانے کے لیے رونے لگیں گے۔ کسی شاعر کو بھی اس کے اپنے شہر کے لوگ اس طرح سر آنکھوں پر نہیں بٹھاتے۔ ایسی مزاجداری نہیں کرتے۔ میں نے کہا نا، سب نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے، گھر کی مرغی دال برابر سمجھا ہی نہیں۔ صدیوں کی ناقدر دانی ابنائے وطن کی روایت توڑ دی، حد ہے بھئی واقعی حد وہ روز سنائے اور سال بھر تک وہی ایک چیز سناتا رہے تو بھی ہمہ تن گوش بن جاتے ہیں۔ خدا جانے کون سا منتر پڑھ کر پھونک دیا ہے، اکتانے کا نام نہیں لیتے، باسی پرانی بوسیدہ غزلیں تک شوق سے سنتے ہیں اور دوسرے شاعروں کی سائیکلوجی خراب ہوتی ہے۔

اصل میں اس کی آواز میں جادو ہے، گہری طرحداری، خراد پر چڑھی ہوئی آواز۔ جب غزل چھیڑتا ہے تو آپ ساز بن جاتے ہیں اور اماوس کی رات میں گویا دیپک سا جل اٹھتا ہے۔ مگر جہاں آپ نے شوق کا اظہار کیا کہ لگے نخرے دکھانے، اصرار کیجئے کہ غزل ترنم سے سناؤ تو تحت اللفظ پڑھنے لگے گا۔ بے سُروں کو تو گانے کا شوق ہے مگر اس کا حال یہ ہے کہ ذرا آواز کی تعریف کی اور تحت اللفظ پر اُتر آئے۔ میرا خیال ہے کہ جشنِ مخدوم میں ایک ریزولیشن پاس کر دیا جائے کہ مخدوم جب سنائے ترنم سے سنائے مجھ سے عرب ملکوں کی سیاحت کر کے آنے والے ایک سیاح نے کہا، آہ، ام کلثوم کیا، آواز اس کی ہے ساٹھ برس کی ہو چکی مگر آواز کا جادو نہیں ٹوٹتا۔ میں نے کہا آپ نے مخدوم کو نہیں سنا۔ ساٹھ برس سے تو ہم ہی سن رہے ہیں مگر آواز کا کلف نہیں ٹوٹتا، بلکہ ابرق سی چمکنے لگی ہے۔

ریزولیشن کی بات آئی ہے تو ایک ریزولیشن اور پاس کرنا ہوگا۔ وہ یہ کہ جب بھی ادبی محفلوں میں مخدوم آئے تو اپنی لمبی لمبی تقریروں سے بور نہ کرے، نظم سنایا کرے۔ مروت میں لوگ اس کی تقریروں کو جھیل لیتے ہیں تو سمجھتا ہے کہ اس کی تقریر سننے کے لیے بیٹھے ہیں۔ حالانکہ سب اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ اس لمبی تقریر کے بعد شعر

سُنائے گا۔ تقریر سُننی ہو تو راج سے سن لیں گے ہمارے لیے مخدوم شاعر ہے اور اس کا شعر سننے کے لیے ہی ہم آتے ہیں۔ تقریریں وہ ادب کی سرحد سے باہر جلسوں اور جلوسوں میں کر سکتا ہے۔

مخدوم شاعر بھی ہے۔ شخصیت بھی، جادو بھی ہے اور جادوگر بھی، مگر ہے بڑا لیوٹ، اس کا اعتبار مشکل ہے۔ وہ جب نہایت سنجیدگی سے باتیں کرتا نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ کسی کو بنا رہا ہے اور بننے والے کو خبر بھی نہ ہوگی۔ آندھرا پردیش نیا نیا بنا تھا۔ ایک خاتون اُردو سے بالکل ناواقف اپنی دانست میں بے حد با اثر، ایک محفل میں مخدوم کو شعر پڑھتے سُن کر بے حد متاثر ہوئیں۔ آواز یقیناً کانوں میں رس گھول گئی ہوگی۔ شفقت سے پُوچھا آپ کیا کام کرتے ہیں۔ مخدوم نے سوکھا مُنہ بنا کر مظلومیت سے دُکھڑا رویا کہ بیکار ہوں، بےچاری ریڈیو اسٹیشن میں کام دلانے کا پکّا وعدہ کر بیٹھیں اور مخدوم نے ان کی سرپرستی کے انداز کو اور شہہ دی۔ انگلش میں ان سے بات کرتا اُردو میں کامنٹری دیتا جاتا۔ پاس بیٹھنے والوں کا بُرا حال تھا۔ ایکٹنگ تو اس کے لیے فطری تھی۔ بعد میں جب خاتون محترم کو معلوم ہوا کہ یہ تو لال مخدوم ہے تو پھر نام سے ہی بدکنے لگیں۔

وہ تو خیر۔ مگر یہ سردار جعفری خاصا چالو آدمی ہے، وہ بھی جھانسے میں آ گیا، جب مخدوم نے اپنی آواز کا سلسلہ نسبی حضرت بلال حبشی سے ملایا تو اُس نے ایک مضمون لکھ مارا اور شاید آج تک خبر نہ ہوئی۔ حالانکہ یہ چار سو بیس جب چاہتا ہے سقراط، بقراط بن جاتا ہے جب چاہتا ہے قلوپطرہ اور قرۃ العین کا عاشق۔ یہ تو دلّی کی راجدھانی جیسا ہے جس نے کبھی کسی سے سچ بولا نہ وفا کی۔ مگر وہ لوگ بھی خوب جانتے ہیں کہ وہ سنجیدہ باتیں لطیفوں کی طرح بیان کرتا ہے۔ اور گپ مارتے وقت افلاطون کی طرح سنجیدہ اور ذی شعور نظر آتا ہے وہ بھی جو ہمیشہ سے اُسے جانتے ہیں۔ بارہا اُلّو بنے ہیں، کھسیائے ہیں، وہ تو گرگٹ ہے۔ جب دیکھئے ایک نئے رنگ میں نظر آتا ہے اعتبار ہی نہیں کیا جا سکتا کہ اس بہروپیئے کا سچا روپ کون سا ہے۔

مخدوم اپنی مقبولیت پر آپ ہی نازاں ہے کہ مجھے سب چاہتے ہیں، چاہیں نہیں تو جائیں کہاں، جو آپ کے سر پر سوار ہی ہو جائے اسے سر پہ بٹھانا ہی پڑتا ہے

کوئی گھر ایسا نہیں جہاں وہ نہ جا سکتا ہو۔ عورتوں میں عورت، مردوں میں مرد —
سیاست دانوں میں اپوزیشن لیڈر اور بچوں میں سرکس کا مسخرہ۔ میں نے بارہا اسے نہایت
ہی گھریلو قسم کی عورتوں سے بگھارے بیگن یا انڈوں کے کٹ کی فرمائش کرتے اور انبا ڑے
کے اچار کی ترکیب پوچھتے سُنا ہے۔

مخدوم کو اپنے بلیو بلیک حُسن پہ بڑا ناز ہے۔ اب جو بنتّی بھائی نے اُسے
اجنتا کی مورتی قرار دیا ہے تو خدا جانے اور کیا مزاج دکھائے، پہلے ہی سے وہ اپنے
آپ کو دکن کی سنگلاخ چٹانوں سے ترشا ہوا صنم سمجھتا ہے۔

مگر مخدوم سخت کافر ہے۔ بُرا بھلا کہہ کر بھی عزیز رکھنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک
بار "شامِ بہاراں" میں، میں نے اسے کافر کہہ دیا تھا تو دوسرے ہی دن کئی مولویوں
نے خطوط بھیجے اور بُرا بھلا کہا، لکھا تھا غزل کا کافر ہے۔ سچ مچ کا فر نہیں، اُنھیں
یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن راہِ راست پر آجائے گا۔ عوام بھی کہتے ہیں، دہریہ
ہے تو کیا ہوا، دیکھ لیجئے بڑے پیر کے نام کی برکت سے کیا نام نکالا ہے۔

یہ سب سُن کر وہ مُرستا ہے۔ مُرستا لفظ دکنی زبان میں نہایت بلیغ ہے اور
وہ مخدوم پہ صادق آتا ہے۔ اب بھی دیکھئے، کل سے مُرس رہا ہے۔

مجھے آج سروجنی نائیڈو کی بیٹی لیلامنی یاد آرہی ہیں۔ کالج میں کوئی تقریب
ہو وہ سب سے آخر میں نیشنل اینتھم کی فرمائش کرتیں۔ وہ خمِ گردن وہ دستِ ناز،
وہ اُن کا سلام۔ مگر لعنت ہے مخدوم پہ جس کے ایسے قدردان رہے ہوں وہ اپنی
قدر گنواتا ہے۔ کچھ کہئے تو ناراض ہوتا ہے۔ لڑنے مرنے، مارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے
کس قدر خواہش تھی کہ وہ مقطع کہے۔ کتنے اصرار پر لکھا۔ مگر بد ذوقی کی حد ہے جسے چاہتا
ہے، شعلہ رُخ شعلہ بدن بنا دیتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ساٹھ سالہ عمر کا اثر چہرے مہرے پر نہ سہی آنکھوں اور کانوں پر
ضرور ہوا ہے۔ آنکھوں کے اتنے اچھے اچھے ڈاکٹر شہر حیدرآباد میں موجود ہیں وہ یقیناً مخدوم
کو بھی جانتے ہوں گے، اُنھیں کیسے گوارا ہے کہ ان کی دور دور تک بدنامی ہو۔ اب بھی
وقت ہے کہ ایک عینک اور ایک سماعت کا آلہ اس کی نذر کیا جائے۔

اس کا مجموعہ "بساطِ رقص" اجرا ہوگیا۔ کچھ نظمیں تو بالکل راک ان رول کرتی معلوم ہوتی ہیں، بلکہ ٹوسٹ اور شیک، اس لیے جب بے حد ینگ اسمارٹ لڑکیاں مخدومؔ کو سننے اور ADMIRE کرنے آتی ہیں اور ڈاؤن ہونے لگتی ہیں کہ اللہ کتنے سویٹ ہیں مخدومؔ صاحب تو میں خطرے کی گھنٹی بجا دیتی ہوں، وہ جو سفید سر والے بزرگ راج بہادر بیٹھے ہیں نا ان سے فل ٹن ایریں بڑے ہیں اور کئی نواسے نواسیوں کے نانا حضرت۔ وہ بڑی بے اعتباری سے "او گاڈ" کہہ کر سنبھل جاتی ہیں اور وقت کے سر پہ سے خطرہ ٹل جاتا ہے، خدا معلوم مخدومؔ کیوں نہیں سوچتا کہ اور شاعر چاہے جو کریں مگر مخدومؔ کو لوگ چاہتے ہیں تو اس سے کچھ معیاروں کے طلب گار بھی ہیں۔

مگر معلوم نہیں ہنسنے، بولنے کھلکھلانے والا مخدومؔ شعر سناتا ہے تو مجھے وہ بالکل تنہا نظر آتا ہے، تنہا مسافر، شب گزیدہ جو اپنے دل کا چراغ جلائے سب کے لیے راہ تلاش کر رہا ہو۔ آپ اس کی باتیں سن کر ہنستے ہوں گے مگر شعر سن کر دل جیسے پگھلنے لگتا ہے۔ اسی لیے کافر ہے، کمینہ ہے، سب کچھ ہے مگر ؎

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو\
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

▲▲

پڑھنے والوں سے

شعر کہنے کی طرح شعر پڑھنا خود ایک تخلیقی عمل ہے، شعر کہتے ہوئے شاعر اپنے آپ کو بھی بدلتا جاتا ہے۔ شعر پڑھنے والا بھی نہ صرف پڑھنے کے عمل میں بدلتا ہے بلکہ وہ اختراع بھی کرتا ہے اپنے تجربے کی بنا پہ۔ جب آپ "گلِ تر" پڑھیں تو شاید آپ بھی اس عمل سے گزریں، ذہن "سرخ سویرا" اور "گلِ تر" میں مقابلہ بھی کرنے لگے گا۔ شاید یہ خیال بھی آئے کہ کلام کا یہ مجموعہ اپنی سج دھج، نفسِ مضمون، حقیقت، ندرت، جمالیاتی کیفیت و کمیّت اور تاثر کے اعتبار سے "سرخ سویرا" سے مختلف ہے۔

بعض قارئین کو "سرخ سویرا" کی وہ نظمیں اور اشعار شاید یاد آجائیں جو انھیں متاثر کر چکے ہیں!

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

جو چھو لیتا میں اس کو، وہ نہا جاتا پسینے میں
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کردوں

حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
اک نئی دُنیا، نیا آدم بنایا جائے گا
سُرخ پرچم اور اونچا ہو، بغاوت زندہ باد

یہ تھا "سرخ سویرا" کا رنگ، "گلِ تر" میں یہ رنگ ملے گا:

ہجوم بادۂ و گُل میں، ہجوم یاراں میں
کسی نگاہ نے جُھک کر مرے سلام لیئے

تحفۂ برگِ گُل و بادِ بہاراں لے کر
قافلے عشق کے نکلے ہیں بیابانوں سے

کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل
تمام رات غزل گائیں دیدِ یار کریں

آج تو تلخئ دوراں بھی بہت ہلکی ہے
گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

ہر شام سجائے ہیں تمنّا کے نشیمن
ہر صبح مے تلخئ ایّام بھی پی ہے

غمزدو تیشے کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے
اٹھو کہ فرصتِ دیوانگی غنیمت ہے

الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو، کوہکن کی جیت ہو

ہمدمو ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

یہ فرق میری نظر میں ایک نیا پن ہے جو عمر، تجربہ اور خود عہدِ حاضر کی نوعیت کے اپنے ماسبق سے مختلف ہونے کا نتیجہ ہے جو سماجی اور شعوری ارتقا ، کی نشان دہی کرتا ہے، پھر بھی انسان دوستی اور سمٹا ہوا جمالیاتی اثر قدرِ مشترک ہیں۔

زمان و مکان کا پابند ہونے کے باوجود شعر بے زماں (TIME LESS) ہوتا ہے اور شاعر اپنی ایک عمر میں کئی عمریں گزارتا ہے، سماج کے بدلنے کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات اور احساسات بھی بدلتے جاتے ہیں، مگر جبلتیں برقرار رہتی ہیں۔ تہذیب، انسانی جبلّتوں کو سماجی تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے کا مسلسل عمل ہے، جمالیاتی حس انسانی حواس کی ترقی اور نشو و نما کا دوسرا نام ہے، اگر انسان کو سماج سے الگ چھوڑ دیا جائے تو وہ ایک گونگا وحشی بن کر رہ جائے گا جو اپنی جبلّتوں پر زندہ رہے گا۔ فنونِ لطیفہ انفرادی اور اجتماعی تہذیبِ نفس کا بڑا ذریعہ ہیں جو انسان کو وحشت سے شرافت کی بلندیوں پر لے جاتے ہیں۔

شاعر اپنے گرد و پیش کے خارجی عالم اور دل کے اندر کی دُنیا میں مسلسل کشمکش اور تضاد پاتا ہے، یہی تضاد تخلیق کی قوتِ محرکہ بن جاتا ہے۔

شاعر اپنے دل میں چھپی ہوئی روشنی اور تاریکی کی آویزش کو اور روحانی کرب و اضطراب کی علامتوں کو اُجاگر کرتا اور شعر میں ڈھالتا ہے۔ اس عمل سے تضادات تحلیل ہو کر تسکین و طمانیت کے مرکب میں تبدیل ہوتے ہیں۔ شاعر بحیثیت ایک فردِ معاشرہ، حقیقتوں سے متصادم اور متاثر رہتا ہے، پھر وہ دل کی جذباتی دنیا کی خلوتوں میں چلا جاتا ہے۔ روحانی کرب و اضطراب کی بھٹّی میں تپتا ہے شعر کی تخلیق کرتا ہے اور داخلی عالم سے نکل کر عالمِ خارج میں واپس آتا ہے تاکہ نوعِ انسانی سے قریب تر ہو کر ہم کلام ہو۔ باہمہ اور بے ہمہ کا یہی وہ نکتہ ہے جسے زوال یافتہ ادیب "انا" اور "انفرادیت" سے تعبیر کرتا ہے۔

شعر میں ہم ماورا کی حدوں کو چھوتے ہیں مگر شعر سماج سے ماورا نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ شعر بے کاری کی اولاد ہے، مگر مَیں ایک محروم بے کاری انسان ہوں۔ "گلِ تر" کی نظمیں، غزلیں انتہائی مصروفیتوں میں لکھی گئی ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے کہ مَیں لکھنے پر مجبور کیا جا رہا ہوں۔ سماجی تقاضے پُر اسرار طریقے پر شعر لکھواتے رہے ہیں۔ زندگی "ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلّی" ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ مَیں نے کچھ لکھا ہی نہیں۔

مخدوم محی الدین

حیدر آباد

"گلِ تر" کا پیش لفظ

۲۴۔ جولائی ۱۹۶۱ء

راج بہادر گوڑ

مخدومؔ محی الدین

مخدومؔ کا سارا کلام، مخدومؔ کی وفات کے کوئی سات سال کے بعد، "بساطِ رقص" کے نقشِ ثانی کی حیثیت سے ادبی ٹرسٹ نے شایع کیا تھا اور اب اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی جانب سے "بساطِ رقص" کی طباعت کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

کون مانے گا کہ مخدومؔ کو ہمیں چھوڑے چودہ[۱۴] سال کا عرصہ ہوگیا۔ ابھی کل کی تو بات ہے کہ مخدومؔ نے فلاں مشاعرے میں کلام سنایا تھا۔ قانون ساز کونسل میں تقریر کی تھی۔ مزدوروں کی ہڑتال کی رہنمائی کی تھی اور اُجرتوں کے معاہدے پر دستخط کئے تھے۔

مگر زمین سورج کے اطراف گردش لگاتی ہی رہی اور چودہ سال ہوگئے، آج "بساطِ رقص" تیسری مرتبہ شایع ہو رہا ہے تو کم سے کم ایک نسل کے لوگ تو ایسے ہونگے ہی جن سے مخدومؔ کی پہچان کرانی ضروری ہے۔

مخدومؔ کا اصل، پورا اور خاندانی نام "ابو سعید محمد مخدوم محی الدین قدری" تھا۔ وہ ۴۔ فروری ۱۹۰۸ء کو ضلع میدک کے ایک دیہات میں پیدا ہوئے اور یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے انھوں نے پہلے پہل "دِل دھڑکنے کی

صدا" سُنی، گاؤں کی "نا آشنائے سیم و زر، دخترِ پاکیزگی" سے آنکھیں چار ہوئیں۔

جب شعور نے انگڑائی لی تو مخدومؔ نے دیکھا کہ ان کا محبوبِ مشرق، مغربی چیلوں کا لقمہ ہے، ایک مسلسل رات ایک بھٹکتی ہوئی روح ہے۔ ایک مرگِ بے قیامت ہے۔

پھر انھوں نے دیکھا کہ ہمالہ کے پرے اُفق پر انقلاب کا ایک نیا آفتاب طلوع ہو رہا ہے اور ایک "جہانِ نو" کی بشارت دے رہا ہے۔

ہندوستانی قوم کی محرومیوں نے مخدومؔ کو درد و کرب دیا۔ ایک نئی دنیا کے جُنوں پرور تصوّر نے ان کو آشفتہ سری دی۔ پھر وہ اس ممکن الحصول تابناک مستقبل کی طرف حیات لے کے، کائنات لے کے، سارے زمانے کو ساتھ لے کے چل پڑے، اور بھی عوامل مخدومؔ کی شاعری کے محرکات ہیں۔

مخدومؔ کے پاس آرزو ہے، مگر غمِ آرزو نہیں۔ حال کی نا آسودگی سے وہ تڑپ جاتے ہیں لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی قنوطیت کا شکار نہیں ہوتے، کیونکہ وہ مستقبل سے مایوس نہیں۔ وہ امید سے خوشی اور جدو جہد سے اعتماد حاصل کرتے ہیں۔

مخدومؔ چوٹی کے شاعر ہی نہیں، چوٹی کے ٹریڈ یونین اور کمیونسٹ رہنما بھی رہے ہیں۔ مخدومؔ کا ہنر ہی یہ ہے کہ وہ قلم کو تلوار میں اور تلوار کو قلم میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ وہ عوام کے مصروف قدموں سے قدم ملا کر چلتے ہیں ان کی لڑائیوں میں شریک رہتے ہیں اور پھر ان ہی تجربوں کو، عوام کے ارمانوں کو شعر کے قالب میں ڈھال کر پیش کر دیتے ہیں۔ یا ہمہ اور بے ہمہ کا یہ مسلسل عمل ان کی زندگی میں جاری رہا اور یہی ان کی شعری تخلیق کا راز وجواز ہے انھوں نے خود ہی کہا ہے کہ کوئی ان سے شعر کہلواتا رہتا ہے۔

مخدومؔ کی رومانی شاعری بھی ان کی زندگی کے بلند نصب العین کے تابع ہے۔ وہ روایتی رومانی شاعری سے الگ بھی ہے اور ارفع بھی۔ ان کا پیار، شب کی تاریکی میں کئے جانے والا کوئی گناہ نہیں، بلکہ ایک پاکیزہ جذبہ ہے ؎

خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

★

ہماری خلوتِ معصوم رشکِ طور ہوتی تھی
مَلک جھولا جھلاتے تھے، غزل خواں حُور ہوتی تھی

★

مخدومؔ کے پاس رقیب کی شکایت، ہجر کا رونا، شیخ کی غیبت، یہ کچھ نہیں جو روایتی، رومانی اردو شاعری کی خاص علامتیں ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں کہ مخدومؔ جبلّتوں کے غلام نہیں تھے بلکہ اس کی یہ وجہ بھی ہے کہ مخدومؔ جس تہذیبِ نو کے نقیب ہیں وہ انسانیت کو شرافت کی بلندیوں پر پہنچا دیتی ہے اور مخدومؔ انٹلکچول اعتبار سے ان بلندیوں پر پہنچ چکے تھے

مخدومؔ کی سرگرمِ عمل اور محرومِ فرصت زندگی ان کے اپنے ساتھیوں کے لیے انسپریشن رہی ہے اور آئندہ نسلوں کے لیے نمونہ رہے گی۔ مخدومؔ کے متعلق ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے صدر نشین کامریڈ ڈانگے نے کہا:

"مخدومؔ شاعرِ انقلاب ہے مگر وہ رومانی شاعری سے بھی دامن نہیں بچاتا بلکہ اس نے زندگی کی ان دونوں حقیقتوں کو اس طرح یکجا کر دیا ہے کہ انسانیت کے لیے۔ بے پایاں محبت کو انقلاب کے مورچوں پر ڈٹ جانے کا حوصلہ ملتا ہے۔ مخدومؔ شیشے کے محل میں رہنے والا شاعر نہیں وہ انقلاب اور اس کے آدرش کی حمایت میں بڑی بے باکی سے لکھتا ہے اسی

لیے اس کی شاعری اتنی پُر اثر ہے کہ لاکھوں کے دل کی آواز بن گئی۔

"مخدومؔ کی شاعری اور خیالات نہ تو آسمان سے ٹپکے ہیں نہ حقّہ کے کش سے نکلے ہیں۔ بلکہ وہ عوام کے لیے لڑتا رہا ہے۔ اس نے تلنگانا کے کسانوں کی روپوشش اور چھاپہ مار لڑائیوں میں ان کا ساتھ دیا ہے۔ اس نے انقلاب اور اس کے آدرش کو اس وقت اپنایا جب کہ وہ "باعزت استاد" تھا۔ مخدومؔ نے پہلے ذہنی طور پر یہ راہ اختیار کی اور پھر عملی طور پر مزدور طبقہ کی لڑائیوں میں شریک ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا شاعر ٹریڈ یونینوں کی شرحِ اجرت کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے اور اس کے ساتھ اپنے نئے نغمے سُنانے میں مسرّت محسوس کرتا ہے۔"

غرض مخدومؔ نے دیکھا کہ "محنت اور محبّت" دونوں ہی محرومیوں سے دست و گریباں ہیں اور ایک خوش آئند مستقبل کے لیے پیہم جدوجہد میں مصروف ہیں۔ بس یہی خیال مخدومؔ کی زندگی اور مخدومؔ کی شاعری دونوں کا مرکزی نکتہ ہے ؎

الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو، کوہکن کی جیت ہو

★

کاش مخدومؔ جیتے ہوتے اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ یہ "بساطِ رقص" کس قدر "بسیط" ہوگئی ہے۔ وہ ویت نام جہاں رات "دامنِ کوہ میں چپ چاپ اُتر آتی" تھی اور "راستوں سے چمٹ جاتی" تھی۔ وہ "کرب و کراہ" اور نالہ و شیون کا ویت نام آج متحد ہے، آزاد ہے دنیا کی سب سے بڑی سامراجی طاقت کی اس چھوٹی سی قوم نے "کلائی مروڑ دی" ـــــــ

آج انگولا آزاد ہے۔ عرب سخت آزمائشوں کے دور سے مگر مستعدی کے ساتھ مصروفِ سفرِ آزادی ہیں۔ پرتگال میں سرزمینِ یورپ کا قدیم ترین فاشست نظام دم توڑ چکا ہے۔ "صدائے تیشہ" کامراں ہو گئی ہے۔ "کوہکن" ہر طرف جیت رہا ہے۔

مگر پروفیسر ابوظفر عبدالواحد نے یہ تو تسلیم ہی نہیں کیا کہ مخدوم مر چکے ہیں۔ انھوں نے کہا ؎

بساطِ رقص کا خالق، نئی سحر کا ظہور
شباب و شعر کا شیدائی، عاشقِ مزدور

★

مجھے یہ لگتا ہے، روپوش ہو گیا مخدوم
مخدوم ہی کا مصرع دہراؤں ع
تُو نہیں ہے تری چشمِ نگراں باقی ہے

●

طور

یہیں کی تھی محبت کے سبق کی ابتدا میں نے
یہیں کی جرأتِ اظہارِ حرفِ مُدعا میں نے
یہیں دیکھے تھے عِشوے ناز و اندازِ حیا میں نے
یہیں پہلے سُنی تھی دِل دھڑکنے کی صدا میں نے

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

دِلوں میں ازدہامِ آرزو لب بند رہتے تھے
نظر سے گفتگو ہوتی تھی دم اُلفت کا بھرتے تھے
نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے
خدا بھی مُسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

وہ کیا آنا کہ گویا دور میں جامِ شراب آنا
وہ کیا آنا رنگیلی راگنی رنگیں رباب آنا
مجھے رنگینیوں میں رنگنے وہ رنگیں سحاب آنا
لبوں کی مے پلانے جھومتا مستِ شباب آنا

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

حیا کے بوجھ سے جب ہر قدم پر لغزشیں ہوتیں
فضا میں منتشر رنگیں بدن کی لرزشیں ہوتیں
ربابِ دل کے تاروں میں مسلسل جنبشیں ہوتیں
خِفائے راز کی پر لُطف باہم کوششیں ہوتیں

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

بہے جاتے تھے بیٹھے عِشق کے زرّیں سفینے میں
تمناؤں کا طوفاں کروٹیں لیتا تھا سینے میں
جو چھُو لیتا میں اس کو وہ نہا جاتا پسینے میں
مئے دو آتشہ کے سے مزے آتے تھے جینے میں

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

بَلائے فکرِ فردا ہم سے کوسوں دُور ہوتی تھی
سُرورِ سرمدی سے زندگی معمور ہوتی تھی
ہماری خلوتِ معصوم رشکِ طور ہوتی تھی
مَلَک جھولا جھُلاتے تھے غزل خواں حُور ہوتی تھی

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

نہ اب وہ کھیت باقی ہیں نہ وہ آبِ رواں باقی
مگر اُس عیشِ رفتہ کا ہے اک دُھندلا نشاں باقی

ساگر کے کنارے

مندر میں پجاری لگے ناقوس بجانے
وہ اُن کے بھجن پیارے وہ گیت اُن کے سُہانے
تاریکیٔ شب اوڑھ کے رخصت ہوا عصیاں
تقدیس کے جاری ہوئے ہر سمت ترانے
وہ چھاؤں میں تاروں کی وہ کھیتوں کے کنارے
دہقان بھی بھیروں کی لگا تان اُڑانے
کوئل نے کسی کنج سے کُوکُو کی صدا دی
مرغانِ چمن گانے لگے صبح کے گانے
انگڑائیاں لیتا ہوا طوفانِ جوانی
مَلتا ہوا آنکھیں اُٹھا فتنوں کو جگانے
کچھ لڑکیاں آنچل کو سمیٹے ہوئے بریں
گگری لیے سر پر چلیں پانی کے بہانے

انگشتریِ حُسن کے انمول نگینے
سرچشمے محبت کے مسرت کے خزانے
چلتی ہیں اس انداز سے دامن کو سنبھالے
صدقے ہوی شوخی تو بلائیں لیں اَدا نے
پانی میں لگی آگ پریشان ہے مچھلی
کچھ شعلہ بدن اُترے ہیں پانی میں نہانے
چہروں کو، کبھی شرم سے آنچل میں چھپانا
گہ کھیلنا پانی سے وہ جھینپ اپنی مٹانے
تالاب پہ افلاک کے گُم گشتہ ستارے
آتے ہیں صبح ہوتے ہی ساگر کے کنارے

اے حُسن کے تاجدار آیا آیا
اے یار، اے غم گسار آیا آیا
او کارِ جہاں دُور ہو لِللہ نہ چھیڑ
ہاں ہم سفرِ بہار آیا آیا

تلنگن

پھرنے والی کھیت کی مینڈوں پہ بَل کھاتی ہوی
نرم و شیریں قہقہوں کے پھول برساتی ہوی
کنگنوں سے کھیلتی اوروں سے شرماتی ہوی
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو، گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

ارض، یکسر گوش ہے خاموش ہیں سب آسماں
راگ سننے رُک گئے ہیں بادلوں کے کارواں
ہاں ترانہ چھیڑ جنگل کی مری غنچہ وہاں
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو، گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

دیکھنے آتے ہیں تارے شب میں سُن کر تیرا نام
جلوے صبح و شام کے ہوتے ہیں تجھ سے ہم کلام
دیکھ فطرت کر رہی ہے تجھ کو جُھک جُھک کر سلام
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو، گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

دُخترِ پاکیزگی نا آشنائے سیم و زر
دشت کی خود رَو کلی تہذیبِ نَو سے بے خبر
تیری خس کی جھونپڑی پر جُھک پڑے سب بام و در
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو، گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

لے چلا جاتا ہوں آنکھوں میں لیے تصویر کو
لے چلا جاتا ہوں پہلو میں چھپائے تیر کو
لے چلا جاتا ہوں پھیلا راگ کی تنویر کو
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو، گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

باغی

رعد ہوں برق ہوں بےچین ہوں پارا ہوں میں
خود پرستار، خود آگاہ خود آرا ہوں میں
گردنِ ظلم کٹے جس سے وہ آرا ہوں میں
خرمنِ جَور جلادے وہ شرارا ہوں میں
میری فریاد پہ اہلِ دول انگشت بہ گوش
لا، تبر، خون کے دریا میں نہانے دے مجھے

سرِ پُر نخوتِ اربابِ زماں توڑوں گا
شورِ نالہ سے درِ ارض و سماں توڑوں گا
ظلم پرور، روشِ اہلِ جہاں توڑوں گا
عشرت آبادِ امارت کا مکاں توڑوں گا
توڑ ڈالوں گا میں زنجیرِ اسیرانِ قفس
دہر کو پنجۂ عسرت سے چھڑانے دے مجھے

برق بن کر بُتِ ماضی کو گرانے دے مجھے
رسمِ کہنہ کو تہہ خاک مِلانے دے مجھے
تفرقے مذہب و ملّت کے مِٹانے دے مجھے
خوابِ فردا کو بس اب حال بنانے دے مجھے
آگ ہوں آگ ہوں ہاں ایک دہکتی ہوئی آگ
آگ ہوں آگ بس اب آگ لگانے دے مجھے

آسمانی لوریاں

روزِ روشن جا چکا، ہیں شام کی تیاریاں
اُڑ رہی ہیں آسماں پر زعفرانی ساریاں
شام رخصت ہو رہی ہے رات کا مُنہ چوم کر
ہو رہی ہیں چرخ پر تاروں میں کچھ سرگوشیاں
جلوے ہیں بے تاب پردے سے نکلنے کے لیے
بن سنور کر آ رہی ہیں آسماں کی رانیاں
نو عروسِ شب نے پہنا ہے لباسِ فاخرہ
آسمانی پیرہن میں کہکشانی دھاریاں
کارچوبی شامیانے میں رَچی بزمِ نشاط
ساز نے انگڑائی لی بجنے لگی ہیں تالیاں
لاجوردی فرش پہ ہے مُشتری زہرہ کا رقص
نیل تن کرشن کے پہلو میں مچلتی گوپیاں

دست و پا کی نرم و خوش آہنگ ہلکی جنبشیں
یا فضا میں ناچتی ہیں گنگناتی بجلیاں
سرمدی نغمات سے ساری فضا معمور ہے
نطقِ ربِّ ذوالمنن ہیں رات کی خاموشیاں
نیند سی آنکھوں میں آتی ہے جُھکا جاتا ہے سَر
سُن رہا تھا دیر سے مَیں آسمانی لوریاں

○

سجدہ

پھر اُسی شوخ کا خیال آیا
پھر نظر میں وہ خوش جمال آیا

پھر تڑپنے لگا دلِ مضطر
پھر برسنے لگا ہے دیدۂ تر

یاد آئیں وہ چاندنی راتیں
وہ ہنسی چھیڑ دل لگی باتیں

شب تاریک ہے خموشی ہے
کُل جہاں محوِ عیش کوشی ہے

لُطف سجدوں میں آرہا ہے مجھے
چُھپ کے کوئی بلا رہا ہے مجھے

چُوڑیاں بج رہی ہیں ہاتوں کی
آئی آواز، اس کی باتوں کی

اُڑ رہا ہے غبارِ نورِ بدن
پھیلتی جا رہی ہے بوئے دہن

موجِ تسنیم و کیفِ خلدِ بریں
جگمگاتا بدن چمکتی جبیں

اپنے آنچل میں منہ چھپائے ہوئے
آ رہا ہے قدم بڑھائے ہوئے

نغمے پازیب کے سناتے ہوئے
بختِ خفتہ مرے جگاتے ہوئے

عشوہ و ناز کا فسوں لے کر
ساتھ اک لشکرِ جنوں لے کر

دور سے مسکراتا آتا ہے
بجلیاں سی گراتا آتا ہے

وہ کہ رنگیں کرن تبسّم کی
اک مسلسل لڑی ترنّم کی

پردۂ تن میں راگ پوشیدہ
راگ وہ جس میں آگ پوشیدہ

بانسری سی بجائے جاتا ہے
آگ تن میں لگائے جاتا ہے

ایک دنیائے رنگ و بُو بن کر
خوں شدہ دِل کی آرزو بن کر

نئی دلہن کی تھرتھری بن کر
اُس کے ہونٹوں کی کپکپی بن کر

میرے دل میں سما گیا کوئی
میری ہستی پہ چھا گیا کوئی

لمحۂ رخصت

کچھ سننے کی خواہش کانوں کو کچھ کہنے کا ارماں آنکھوں میں
گردن میں حمائل ہونے کی بے تاب تمنّا باہوں میں
مشتاق نگاہوں کی زد سے نظروں کا حیا سے جھک جانا
اِک شوقِ ہم آغوشی پنہاں اُن نیچی بھیگی پلکوں میں
شانے پہ پریشاں ہونے کو بے چین سیہ کاکُل کی گھٹا
پیشانی میں طوفاں سجدوں کا، لب بوسی کی خواہش ہونٹوں میں
وارفتہ نگاہوں سے پیدا ہے ایک اَدائے زلیخائی
اندازِ تغافل تیور سے، رسوائی کا ساماں آنکھوں میں
فُرقت کی بھیانک راتوں کا رنگین تصوّر میں آنا
اِفشائے حقیقت کے ڈر سے ہنس دینے کی کوشش ہونٹوں میں
آنسو کا ڈھلک کر رہ جانا، خوں گشتہ دِلوں کا ندرانہ
تکمیلِ وفا کا افسانہ کہہ جانا آنکھوں آنکھوں میں

جوانی

بیدار ہوئیں مہرِ جوانی کی شعاعیں
پڑنے لگیں عالم کی اُسی سمت نگاہیں

خوابیدہ تھے جذبات بدلنے لگے کروٹ
رُوئے شررِ طور سے ہٹنے لگا گھونگٹ

بھرنے لگے بازو تو ہوے بندِ قبا تنگ
چڑھنے لگا طفلی پہ جوانی کا نیا رنگ

ساغر کی کھنک بن گئی اُس شوخ کی آواز
بربط کی ہوی گدگدی یا جاگ اُٹھے ساز

اعضا میں لچک ہے تو ہے اِک لوچ کمر میں
اعصاب میں پارہ ہے تو بجلی ہے نظر میں
آنے لگی ہر بات پہ رُک رُک کے ہنسی اب
رنگین تموّج سے گراں بار ہوے لب
وہ دیکھ بدلتے ہوے پہلو کوئی اُٹھّا
وہ دیکھ بگاڑے ہوے گیسو کوئی اُٹھّا
وہ دیکھ کہ کس گُل کی مہک پھیلی ہے ہر سُو
وہ دیکھ کہ ہے کون رواں بجتے ہیں گھنگرو
کم بخت اَجل تھی یہ جوانی کی قبا میں
ٹکڑے ہیں کسی دل کے بھی نقشِ کفِ پا میں

حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

یاد ہے

کھیلتا تھا جب لڑکپن سے ترا رنگیں شباب
ہٹ رہی تھی ماہِ عالم تاب کے رُخ سے نقاب
زندگی تھی حُسنِ نو آغاز کا رنگین خواب
یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے

جب کہ سازِ زندگی نغمات سے معمور تھا
ذرّہ ذرّہ میرے دل کی خاک کا جب طور تھا
میں اکیلا ہی نہیں سارا جہاں مسرور تھا
یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے

کھیلتی تھی نوجوانی جب کہ باہوں میں تری
زندگی کی بارشیں تھیں جلوہ گاہوں میں تری
رقص کرتی تھیں تمنّائیں نگاہوں میں تری

یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے

ہر ادائے حُسن پر ہوتا تھا دل جب بے قرار
جب رہا کرتا ملاقاتوں کا باہم انتظار
جب طبیعت تجھ سے ملنا چاہتی تھی بار بار

یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے

رات بھر سونے نہ دیتی تھی مسرت عید کی
جبکہ رہتی تھی دِلوں میں بے قراری دِید کی
ماہتابِ عید بن جاتی کرن خورشید کی

یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے

رات آتی تھی سُنانے سوز کا پیغام جب
مشقِ تحریرِ جنوں بنتا تھا تیرا نام جب
تھا نہ کچھ پیشِ نظر اس عشق کا انجام جب

یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے

★

بات کیا تھی ذکر کس کا تھا کہ ہنگام نشاط
مُسکرانے والی آنکھیں ہچکیاں لینے لگیں

مَیں

تھک کے رہ جاتے ہیں استدلال کے جس جا قدم
ٹوٹ جاتا ہے پہنچ کر جس جگہ منطق کا دَم
خوابِ عقل و ہوش کی مجہول تعبیروں سے دُور
فلسفی کی کس طرح اور کیوں کی زنجیروں سے دُور

میرے رہنے کا جہانِ جاودانی اور ہے
دل کی دنیائے نہاں کی زندگانی اور ہے

خود تراشیدہ بُتِ نازِ آفریں میرا وجود
میری ذاتِ پاک مسجودِ جہانِ ہست و بُود

دوسرا کوئی نہیں رہتا جہاں رہتا ہوں میں
اپنے سیلابِ خودی میں آپ ہی بہتا ہوں میں

میرے سجدوں کے لیے ہی وقف ہے میری جبیں
میری اقلیمِ انا میں دوسرا کوئی نہیں

★

میری آنکھوں کی زباں اور مرے دل کی آواز
نہ سمجھنے کے لیے ہے نہ سُنانے کے لیے

شاعر

کچھ قوسِ قزح سے رنگت لی کچھ نُور چُرایا تاروں سے
بجلی سے تڑپ کو مانگ لیا کچھ کیف اُڑایا بہاروں سے
پھولوں سے مہک شاخوں سے لچک اور منڈووں سے ٹھنڈا سایہ
جنگل کی کنواری کلیوں نے دے ڈالا اپنا سرمایہ
بدمَست جوانی سے چھینی کچھ بے فکری کچھ اَلّڑھ پن
پھر حُسنِ جنُوں پرور نے دی آشفتہ سری دل کی دھڑکن
بِکھری ہوی رنگیں کِرنوں کو آنکھوں سے چُن کر لاتا ہوں
فطرت کے پریشاں نغموں سے اِک اپنا گیت بناتا ہوں
فردوسِ خیالی میں بیٹھا اِک بُت کو تراشا کرتا ہوں
پھر اپنے دِل کی دھڑکن کو پتھّر کے دل میں بھرتا ہوں

انتظار

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
خوش تھے ہم اپنی تمناؤں کا خواب آئے گا
اپنا ارمان برافگندہ نقاب آئے گا
نظریں نیچی کیے شرمائے ہوئے آئے گا
کاکلیں چہرے پہ بکھرائے ہوئے آئے گا
آ گئی تھی دلِ مضطر میں شکیبائی سی
بج رہی تھی مرے غم خانے میں شہنائی سی

پتیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ آہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے
شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی اک آس تھی اَب جانے لگی
صبح نے سیج سے اُٹھتے ہوئے لی انگڑائی
او صبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی

میرے محبوب مری نیند اُڑانے والے
میرے مسجود مری روح پہ چھانے والے
آ بھی جا تاکہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے
آ بھی جا، تا ترے قدموں پہ مری جاں نکلے

کوئی تالو میں مری بیٹھ کے چلّاتا ہے
ڈنک پر ڈنک لگاتا ہے مرے دل کے قریب
آگے بڑھتا ہوں تو قدموں سے چمٹ جاتا ہے
مجھے جانے ہی نہیں دیتا ہے منزل کے قریب

پچھلے پہر کے چاند سے

لذّتِ آغوشِ شب سے چھک گیا ہے ماہتاب
رات کی رانی نے اس سے چھین لی روحِ شباب
لڑکھڑاتا اُونگھتا ہے جانبِ مغرب رواں
زرد چہرے پر عیاں لب ہائے لیلیٰ کے نشاں
رندِ شب بیدار، جا سو جا، سِیاہی اوڑھ کر
خوابِ شیریں کے مزے لے پہلوئے شب چھوڑ کر
موت تیری، زندگیِ مہر کا پیغام ہے
مرمریں دستِ سحر میں دیکھ رنگیں جام ہے

برسات

اِن مست ہواؤں کا یہ برسات کا موسم
تنہائی میں بے یار گزر جائے سِتم ہے
شغلِ مئے و محبوب کا رنگین زمانہ
کالج کی خرافات میں کٹ جائے سِتم ہے
آغازِ جوانی کے گناہوں کا تقدّس
اور دفترِ بے معنیٰ میں دب جائے ستم ہے
جس پیکرِ لذت سے عبارت ہے مسرّت
وہ ہمدمِ دیرینہ بچھڑ جائے سِتم ہے
نو خاستہ محبوب کا مُنہ چومنے والے
اِس رُت میں یہ بے بال و پری ہائے ستم ہے

★

تو نے کِس دل کو دُکھایا ہے تجھے کیا معلوم
کِس صنم خانے کو ڈھایا ہے تجھے کیا معلوم
ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکرِ ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

انتساب

ہم کو بے مائگیِ ضبط دکھانا ہی پڑا
دل کی باتوں کو ترے سامنے لانا ہی پڑا
میں جو خلوت میں بھی ڈرتا تھا سنانے کے لیے
سرِ بازار وہی گیت سنانا ہی پڑا
کھینچ لایا تجھے پردے سے مرا ذوقِ نیاز
میرے پردے میں تجھے جلوہ دکھانا ہی پڑا
تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے دھڑکتے دِل سے
تیرے رُخ سے ترے آنچل کو ہٹانا ہی پڑا

جنگ

نکلے دہانِ توپ سے بربادیوں کے راگ
باغِ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ
کیوں ٹمٹما رہی ہے یہ پھر شمعِ زندگی؟
پھر کیوں نگارِ حق پہ ہیں آثارِ بیوگی؟
عفریتِ سیم و زر کے کلیجے میں کیوں ہے پھانس
کیوں رُک رہی ہے سینے میں تہذیبِ نو کی سانس
امن و اماں کی نبض چُھٹی جا رہی ہے کیوں؟
بالینِ زیست آج اجل گا رہی ہے کیوں؟
اب دُلہنوں سے چھین لیا جائے گا سہاگ
اب اپنے آنسوؤں سے بجھائیں وہ دل کی آگ

بربطِ نوازِ بزمِ الُوہی اِدھر تو آ
دعوت دہِ پیامِ عبودی اِدھر تو آ

اِنسانیت کے خُون کی ارزانیاں تو دیکھ
اِس آسمان والے کی بیدادیاں تو دیکھ

معصُومۂ حیات کی بیچارگی تو دیکھ
دستِ ہوس سے حسُن کی غارتگری تو دیکھ

خود اپنی زندگی پہ پشیماں ہے زِندگی
قربان گاہِ موت پہ رقصاں ہے زندگی

انسان رہ سکے کوئی ایسا جہاں بھی ہے
اِس فتنہ زا، زمیں کا کوئی پاسباں بھی ہے

او آفتابِ رحمتِ دوراں طُلوع ہو
او انجُمِ حمیّتِ یزداں طُلوع ہو

گریباں چاک محفل سے نِکل جاؤں تو کیا ہو گا
تِری آنکھوں سے آنسو بن کے ڈھل جاؤں تو کیا ہوگا
جُنوں کی لغزشیں خود پردہ دارِ رازِ اُلفت ہیں
جو کہتے ہیں سنبھل جاؤ، سنبھل جاؤں تو کیا ہو گا

مشرق

جہل، فاقہ، بھیک، بیماری نجاست کا مکان
زندگانی، تازگی، عقل و فراست کا مسان

وہم زائیدہ خداؤں کا روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام

جھڑ چکے ہیں دست و بازو جس کے اس مشرق کو دیکھ
کھیلتی ہے سانس سینے میں مریضِ دق کو دیکھ

ایک ننگی نعش بے گور و کفن ٹھٹھری ہوی
مغربی چیلوں کا لقمہ خون میں لتھڑی ہوی

ایک قبرستان جس میں ہُوں نہ ہاں کچھ بھی نہیں
اِک بھٹکتی رُوح ہے جس کا مکاں کوئی نہیں

پیکرِ ماضی کا اک بے رنگ اور بے رُوح خول
ایک مرگِ بے قیامت ایک بے آواز ڈھول

اک مسلسل رات جس کی، صبح ہوتی ہی نہیں
خوابِ اصحابِ کہف کو پالنے والی زمیں

اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دُنیا نیا آدم بنایا جائے گا

موت کا گیت

عرش کی آڑ میں اِنسان بہت کھیل چکا
خُونِ اِنسان سے حیوان بہت کھیل چکا
مورِ بے جاں سے سلیمان بہت کھیل چکا
وقت ہے آؤ دو عالم کو دِگرگوں کر دیں
قلبِ گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں
ظلمتِ کفر کو ایمان نہیں کہتے ہیں
سگِ خوں خوار کو انسان نہیں کہتے ہیں
دشمنِ جاں کو نگہبان نہیں کہتے ہیں
جاگ اُٹھنے کو ہے اب خُوں کا تلاطم دیکھو
مَلکُ الموت کے چہرے کا تبسّم دیکھو

جان لو قہر کا سیلاب کسے کہتے ہیں
ناگہاں موت کا گرداب کسے کہتے ہیں
قبر کے پہلوؤں کی داب کسے کہتے ہیں
دورِ ناشاد کو اب شاد کیا جائے گا
روحِ انسان کو آزاد کیا جائے گا

نالۂ بے اثر اللہ کے بندوں کے لیے
صلۂ دار و رسن حق کے رسولوں کے لیے
قصرِ شدّاد کے در بند ہیں بھوکوں کے لیے
پھونک دو قصر کو گر کُن کا تماشا ہے یہی
زندگی چھین لو دُنیا سے جو دُنیا ہے یہی

زلزلو، آؤ دہکتے ہوئے لاؤ آؤ
بجلیو آؤ گرج دار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ
آؤ یہ کُرّۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دَہر کو معمورِ کرم کر ڈالیں

دھُواں

جنّتیں خاک پہ جس رات اُتر آئی تھیں
بدلیاں رحمتِ یزداں کی جہاں چھائی تھیں

عِشرت و عیش کی جس جا کہ فراوانی تھی
جس جگہ جلوہ فگن رُوحِ جہاں بانی تھی

ہاں وہیں میرے دلِ زار نے یہ بھی دیکھا
ہاں مری چشمِ گنہگار نے یہ بھی دیکھا

خونِ دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں

مُحبّت کی چھاؤں

ہم محبت کی چھاؤں میں سوتے تھے جب
خار بھی پھول معلوم ہوتے تھے جب
ابتدائے جُنوں کی وہ اک بات تھی
وہ محبت کی تاروں بھری رات تھی

دل کے تاروں سے مضراب ٹکرا گیا
آتشیں لے اُٹھی کیف سا چھا گیا
حُسن کا وار جو تھا وہ بھرپور تھا
جِس کو دیکھا نظر بھر کے وہ طور تھا

دل کو اِک بار سب دھو گیئں بجلیاں
میری رگ رگ میں حل ہو گیئں بجلیاں
دردِ دل کا بہانہ بنی دل لگی
آنسوؤں کا فسانہ بنی دل لگی

پَل کے پَل میں بدلنے لگی زندگی
غم کے سانچوں میں ڈھلنے لگی زندگی
چاہ کا دِن ڈھلا شام ہونے لگی
دِل دھڑکنے لگا آنکھ رونے لگی

رات اور دن یونہی آتے جاتے رہے
حُسن اور عشق تکمیل پاتے رہے

نامۂ حبیب

کہا ہے مجھ سے جنگل کی اُن آوارہ ہواؤں نے
جو تیری دھڑکنوں کا تحفہ میرے پاس لاتی ہیں
کہ تم کو حسن کی نامہربانی سے شکایت ہے
تمہیں کچی کلی کی بے زبانی سے شکایت ہے
گنہہ نا آشناؤں کی جوانی سے شکایت ہے
کہا ہے مجھ سے جنگل کی اُن آوارہ ہواؤں نے
جو تیری دھڑکنوں کا تحفہ میرے پاس لاتی ہیں

سُنا ہے ضبطِ کو تم دِل کی سنگینی سمجھتے ہو
ادائے خوفِ رسوائی کو خود بینی سمجھتے ہو
یہ کیا سچ ہے مِرے آنسو کو رنگینی سمجھتے ہو
کہا ہے مجھ سے جنگل کی اُن آوارہ ہواؤں نے
جو تیری دھڑکنوں کا تحفہ میرے پاس لاتی ہیں

جُنوں پرور اداؤں سے سنور نے کے اِرادے ہیں
خدا کے عرشِ اُلفت سے اُترنے کے اِرادے ہیں
زمین و آسماں کو ایک کرنے کے اِرادے ہیں
کہا ہے مجھ سے جنگل کی اُن آوارہ ہواؤں نے
جو تیری دھڑکنوں کا تحفہ میرے پاس لاتی ہیں

نیند

یہ کس پیکر کی رنگینی سِمٹ کر دل میں آتی ہے
مِری بے کیف تنہائی کو یوں رنگیں بناتی ہے
یہ کِس کی جنبشِ مژگاں ربابِ دل کو چھوتی ہے
یہ کس کے پیرہن کی سرسراہٹ گنگناتی ہے
مِری آنکھوں میں کِس کی شوخیِٔ لب کا تصوّر ہے
کہ جس کے کیف سے آنکھوں میں میری نیند آتی ہے
سکوت اور شانتی کے ہر قدم پر پھول برساتی
اسیر کاکلِ شب گوں بنا کر مسکراتی ہے
مری آنکھوں میں گھُل جاتی ہے وہ کیفِ نظر بن کر
مجھے قوسِ قزح کی چھاؤں میں پہروں سُلاتی ہے
سحر تک وہ مجھے چمٹائے رکھتی ہے کلیجے سے
دبے پاؤں کرن خورشید کی آکر جگاتی ہے

آزادیٔ وطن

کہو ہندوستاں کی جے   کہو ہندوستاں کی جے

قسم ہے خُون سے سینچے ہوئے رنگیں گلستاں کی
قسم ہے خونِ دہقاں کی قسم خونِ شہیداں کی
یہ ممکن ہے کہ دُنیا کے سمندر خشک ہو جائیں
یہ ممکن ہے کہ دریا بہتے بہتے تھک کے سو جائیں
جلانا چھوڑ دیں دوزخ کے انگارے یہ ممکن ہے
روانی ترک کر دیں برق کے دھارے یہ ممکن ہے
زمینِ پاک اب ناپاکیوں کو ڈھو نہیں سکتی
وطن کی شمعِ آزادی کبھی گُل ہو نہیں سکتی

وہ ہندی نوجواں یعنی علمبردارِ آزادی
وطن کا پاسباں وہ تیغِ جوہردارِ آزادی
وہ پاکیزہ شرارہ بجلیوں نے جس کو دھویا ہے
وہ انگارہ کہ جس میں زیست نے خود کو سمویا ہے
وہ شمعِ زندگانی آندھیوں نے جس کو پالا ہے
اک ایسی ناؤ طوفانوں نے خود جس کو سنبھالا ہے
وہ ٹھوکر جس سے گیتی لرزہ برَاندام رہتی ہے
وہ دھارا جس کے سینے پر عمل کی ناؤ بہتی ہے
چھپی خاموش آہیں شورِ محشر بن کے نکلی ہیں
دبی چنگاریاں خورشیدِ خاور بن کے نکلی ہیں
بدل دی نوجوانِ ہند نے تقدیر زنداں کی

مجاہد کی نظر سے کٹ گئی زنجیر زنداں کی

کہو ہندوستاں کی جے
کہو ہندوستاں کی جے

جہانِ نو

نغمے شرر فشاں ہوں اُٹھا آتشیں رباب
مضرابِ بے خودی سے بجا سازِ انقلاب
معمارِ عہدِ نو ہو ترا دستِ پُرشباب
باطل کی گردنوں پہ چمک ذوالفقار بن
ایسا جہان جس کا اچھوتا نظام ہو
ایسا جہان جس کا اخوّت پیام ہو
ایسا جہان جس کی نئی صبح و شام ہو
ایسے جہانِ نو کا تُو پروردگار بن

وَلی

جہانِ رنگ و بُو سے کھیلنے والا نہ تھا کوئی
شبِ ہجراں کی، سختی جھیلنے والا نہ تھا کوئی
زبانِ نغمہ بے تاثیر تھی مستی کی پیاسی تھی
پریشاں گیت تھے گیتوں کے چہرے پر اُداسی تھی
ترانے حُسن و دِل کے گانے والا ہی نہ تھا کوئی
حسیں فطرت کا جی بہلانے والا ہی نہ تھا کوئی

اک اپنی ترجمانی چاہتے تھے رازِ فطرت کے
کسی داؤد کے محتاج تھے سب سازِ فطرت کے

ابھی نا آشنائے لذّتِ گفتار تھی دُنیا
اسیرِ خامشی تھی بار تھی آزار تھی دُنیا

یکایک دہرِ تیرہ بخت کی قسمت بدلتی ہے
ہَوا بھی زیرِ لب ہنستی ہوئی اِتراتی چلتی ہے

پگھل کر بہہ چلے موسیقیوں کے منجمد دھارے
اُٹھے انگڑائیاں لیتے ہوئے بِستر سے فوّارے

وہ پیغامِ سحر آہی گیا زنجیرِ شب ٹوٹی
وہ اُبھرا مہر، لو وہ زندگانی کی کرن پھوٹی

حجابِ تیرگی قدرت نے جب چٹکی سے سرکایا
تو گہوارے میں اک ہنستا ہوا چہرہ نظر آیا

فضائیں احتراماً سر پہ آنچل ڈال لیتی ہیں
سحر کی بیٹیاں رنگینیوں کی ناؤ کھیتی ہیں

صدا دی آسمانوں نے ستاروں نے، وؔلی آیا
مبارک بادیاں گائیں بہاروں نے، وؔلی آیا

وؔلی وہ ہمدمِ فطرت، وہ یکِ نورِ وجدانی
وہ جبریلِ سخن وہ اوّلیں تلمیذِ رحمانی

یقیں بخشا زباں کو جس نے پہلے اس کے جینے کا
وہ پہلا ناخدا "ہندوستانی" کے سفینے کا
دیئے روشن کیے مندر میں کعبے کے چراغوں سے
ہزاروں جنّتیں آباد کردیں دل کے داغوں سے
وہ میراثِ جہاں وہ خُلد کا پیغام آتا ہے
دکن کی سرزمیں پر زندگی کا جام آتا ہے

اِقبالؔ

اس اندھیرے میں یہ کون آتش نوا گانے لگا
جانبِ مشرق اُجالا سا نظر آنے لگا

موت کی پرچھائیاں چھٹنے لگیں چھٹنے لگیں
ظلمتوں کی چادریں ہٹنے لگیں ہٹنے لگیں

اِک شرارہ اُڑتے اُڑتے آسمانوں تک گیا
آسماں کے نور پیکر نوجوانوں تک گیا

عالَمِ بالا پہ باہم مشورے ہونے لگے
آسمانوں پر زمیں کے تذکرے ہونے لگے

پھر اندھیرے میں وہی آتش نوا پایا گیا
زندگی کے موڑ پر گاتا ہوا پایا گیا

وہ نقیبِ زندگی شام و سحر گاتا گیا
کُو بہ کُو ، کوچہ بہ کوچہ ، در بدر گاتا گیا

گیت سننے کے لیے خلقِ خدا آنے لگی
گردنوں کو جنبشیں دے کر یہ فرمانے لگی

نغمۂ جبریل ہے انسان کا گانا نہیں
صُورِ اسرافیل ہے دنیا نے پہچانا نہیں

عرش کی قندیل ہے اک آسمانی راگ ہے
راگ کیا ہے سر سے پا تک عشق کی اِک آگ ہے

ٹوٹے ہوئے تارے

کہا ہے مجھ سے یہ ٹوٹے ہوئے ستاروں نے
فلک کی گود سے چھوٹے ہوئے ستاروں نے
نوائے درد مری کہکشاں میں ڈوب گئی
وہ چاند تاروں کے سیلِ رواں میں ڈوب گئی
سمن برانِ فلک نے شرر کو دیکھ لیا
زمیں والوں کے دل کو، نظر کو دیکھ لیا
وہ میری آہ کا شعلہ تھا کوئی تارا نہ تھا
وہ خاکداں کا مسافر تھا ماہ پارا نہ تھا

دِلوں میں بیٹھ گیا تیرِ آرزو بن کر
فلک پہ پھیل گیا، عشق کا لہو بن کر
یہ ساکنانِ فلک درد و غم کو کیا جانیں؟
یہ خاکیوں کی رہِ بیش و کم کو کیا جانیں؟
وہ غم کو پی تو گئے آنسوؤں کو پی نہ سکے
زمیں کے زہر کو پی کر وہ اور جی نہ سکے
فلک سے گرنے لگے ٹوٹ ٹوٹ کے تارے
زمیں پہ ڈھیر ہوئے تیرِ آہ کے مارے
یہ آگ اور بھی اُوپر نکل گئی ہوتی
حریمِ عرش کو چھُو کر نکل گئی ہوتی

قلندر

(چغتائی کی تصویر "قلندر" کو دیکھ کر)

تری نظروں کی زد کو آسماں والوں سے پوچھوں گا
مکاں والوں سے کیا، میں لامکاں والوں سے پوچھوں گا

ہنرور کو صلہ صنعت گری کا مِل گیا ہوگا
"قلندر" کی نظر کو دیکھ کر دل ہِل گیا ہوگا

جُنوں کو عام کر دے دہر کو زیر و زبر کر دے
اِنھیں بے باک نظروں کو ذرا بے باک تر کر دے

غلط آہنگِ سازِ زندگی برباد ہوجائے
جہانِ نغمہ قیدِ ساز سے آزاد ہو جائے

ترا رقصِ جنوں ہم سازِ اِسرافیل ہوجائے
یہ بزمِ غیر بزمِ خاص میں تبدیل ہوجائے

مسیحا دم گُلِ فردوس کِھلتا جا مہکتا جا
حرم کی لاش پر داؤد کے نغمے چھڑکتا جا

اِقبال کی رِحلت پر

جِس رہ نوردِ شوق کو منزل سے عار تھا
جِس موجِ بے قرار کو ساحل سے عار تھا

کِس کی نظر نے اُس کو نظر بند کر دیا؟
اُس برقِ جاں نواز کو پا بند کر دیا؟

شعلہ زمیں کا عرش کی گودی میں سو گیا
اُمّت کا شب چراغ اندھیرے میں کھو گیا

پُرسہ

(بچّے کے انتقال پر ماں کے حضور میں)

نہ رو ہم نشیں یہ جہاں اور ہی ہے
یہاں کی رہِ امتحاں اور ہی ہے
ترے دل کی ٹھنڈک کو تاروں میں ڈھونڈا
ترے پھول کو مرغزاروں میں ڈھونڈا
ترے آنسوؤں کے چراغوں سے ڈھونڈا
ترے دِل کے نوخیز داغوں سے ڈھونڈا
بہاروں کو لوٹانے والی ہوائیں
نہ تیری ہوائیں نہ میری ہوائیں
مرادوں کو بر لانے والی دعائیں
نہ تیری دُعائیں نہ میری دعائیں
دعائیں بھی بے بس ہوائیں بھی بے بس
تری اور مری التجائیں بھی بے بس
نہ وہ اور نہ مَیں اور نہ تو جاودانی
ازل کے مُصوّر کا ہر نقش فانی

وہ

وہ خمِ گردن وہ دستِ ناز وہ ان کا سلام
ابرؤوں کا وہ تکلّم وہ نگاہوں کا پیام
بولتی آنکھوں کا رس گلرنگ عارض کا جمال
مُسکراتا سا تصوّر گنگناتا سا خیال

ایک ایسا غم جو آنسو بن کے بہہ سکتا نہیں
دل جسے محسوس کر سکتا ہے کہہ سکتا نہیں
اور کیا ہو گی کسی کی کائناتِ سال وسِن
عشق کی دو چار راتیں حُسن کے دو چار دن
آہ پہلے نارسا تھی اب کہیں رُکتی نہیں
اب کسی کے آستانے پر جبیں جھکتی نہیں

★

ہر طرف پھیلی ہوی ہے چاندنی ہی چاندنی
جیسے وہ خود ساتھ ہیں اُن کی جوانی ساتھ ہے

نورسؔ

وہ پہلا گیت بہاروں کا وہ ارماں چاند ستاروں کا
جبریلِ امیں کے ہونٹوں کے بے گائے ہوئے نغموں کی صدا
معصوم لڑکپن کے رُخ پر نوخیز جوانی کا غازا
حوروں کے بہشتی نغموں سے جو راگ بنے وہ راگ ہے وہ
جس سے کہ کلیمی ملتی ہے کچھ ایسی ہی اک آگ ہے وہ
تاروں کی محفل سے آکر کلیوں میں سو جانے والی
روشن سُورج کی کرنوں کے جھُرمٹ میں کھو جانے والی
میں تجھ سے محبت کرتا ہوں یہ کہنے کی ہمّت ہو نہ سکی
اظہارِ تمنّا ہو نہ سکا اظہار کی جرأت ہو نہ سکی

آ شاعر کے من میں آجا
آ اپنے نشیمن میں آجا

حویلی

ایک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج
لے رہی ہے نزع کے عالم میں مُردوں سے خراج

اک مسلسل کرب میں ڈوبے ہوے سب بام و در
جس طرف دیکھو اندھیرا جس طرف دیکھو کھنڈر

مار و کژدم کا ٹھکانا جس کی دیواروں کے چاک
اُف یہ رَخنے کس قدر تاریک کتنے ہولناک

جن میں رہتے ہیں مہاجن، جن میں بستے ہیں اَمیر
جن میں کاشی کے برہمن، جن میں کعبے کے فقیر

رہزنوں کا قصرِ شوریٰ، قاتلوں کی خواب گاہ
کِھل کِھلاتے ہیں جرائم جگمگاتے ہیں گناہ

جس جگہ کٹتا ہے سر انصاف کا، ایمان کا
روز و شب نیلام ہوتا ہے جہاں انسان کا
زیست کو درسِ اجل دیتی ہے جس کی بارگاہ
قہقہہ بن کر نکلتی ہے جہاں ہر ایک آہ
سیم و زر کا دیوتا جس جا کبھی سوتا نہیں
زندگی کا بھول کر جس جا گزر ہوتا نہیں
ہنس رہا ہے زندگی پر اس طرح ماضی کا حال
خندہ زن ہو جس طرح عصمت پہ قحبہ کا جمال
ایک جانب ہیں وہیں اُن بے نواؤں کے گروہ
ہاں انھیں بے نان و بے پوششِ گداؤں کے گروہ
جن کے دِل کچلے ہوئے جن کی تمنّا پائمال
جھانکتا ہے جن کی آنکھوں سے جہنّم کا جلال
اے خدائے دو جہاں اے وہ جو ہر اک دل میں ہے
دیکھ تیرے ہاتھ کا شہ کار کس منزل میں ہے
جانتا ہوں موت کا ہم ساز و ہمدم کون ہے
کون ہے پروردگارِ بزمِ ماتم کون ہے
کوڑھ کے دھبّے چھپا سکتا نہیں ملبوس دیں
بھوک کے شعلے بُجھا سکتا نہیں روح الامیں

اے جواں سالِ جہاں جانِ جہانِ زندگی
سار بانِ زندگی روحِ روانِ زندگی!
جس کے خونِ گرم سے بزمِ چراغاں زندگی
جس کے فردوسی تنفّس سے گلستاں زندگی
بجلیاں جس کی کنیزیں زلزلے جس کے سفیر
جس کا دِل خیبر شکن جس کی نظر ارجن کا تیر
ہاں وہ نغمہ چھیڑ جس سے مسکرائے زندگی
تو بجائے سازِ اُلفت اور گائے زندگی
آ اُنھیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں
آ اُنھیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں

مُسافر

ترے ہمرہی کھو گئے رے مسافر مسافر چلئے چل
نہ جانے وہ کیا ہو گئے رے مسافر مسافر چلے چل

تری منزلیں تیری نظروں سے اوجھل
چلے چل چلے چل، چلے چل چلے چل مُسافر

اندھیرے میں اب ساتھ کیا دیکھتا ہے دِیا بجھ گیا ہے
بہرحال چل رات کیا دیکھتا ہے دِیا بجھ گیا ہے

تری منزلیں تیری نظروں سے اوجھل
چلے چل چلے چل، چلے چل چلے چل مُسافر

سمجھ موت کی وادیوں سے گزرتا چلا جا رہا ہے
سحر کے تعاقب میں گرتا اُبھرتا چلا جا رہا ہے

تری منزلیں تیری نظروں سے اوجھل
چلے چل چلے چل چلے چل چلے چل مُسافر

★

آتا مِری دُنیا کو خرابات بناتا.
آنکھوں سے پلاتا کبھی ہونٹوں سے پِلاتا

مُستقبل

چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے
چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے

دھڑکتے دلوں کی صدا آرہی ہے
اندھیرے میں آوازِ پا آرہی ہے
بُلاتا ہے کوئی ندا آرہی ہے

چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے
چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے

نہ سُلطانیٔ تیرگی ہے نہ زاری
نہ تختِ سلیماں نہ سرمایہ داری
غریبوں کی چیخیں نہ شاہی سواری

چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے
چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے

اُڑاتا ہوا پرچمِ زندگانی
سُناتا ہوا عہدِ نو کی کہانی
جِلو میں ظفر مندیاں شادمانی

چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے
چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے

سفینہ مساوات کا کھے رہا ہے
جوانوں سے قربانیاں لے رہا ہے
غلاموں کو آزادیاں دے رہا ہے

چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے
چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے

خلوتِ رنگیں میں بھی ڈستا ہے یُوں دُنیا کا حال
جیسے پیتے وقت بھُوکے بال بچوں کا خیال

قمر

شفق کی پیٹھ کے پیچھے سے آرہا ہے قمر
زمیں پہ نور کی چادر بچھا رہا ہے قمر
درخت چاندی کے ان کے ثمر بھی چاندی کے
ہر اک حسیں کو حسیں تر بنا رہا ہے قمر
حیاتِ نو مجھے آواز دے رہی ہے سُنو
دَبی زبان میں کچھ گنگنا رہا ہے قمر
نگاہِ یار سے جا جا کے مِل رہی ہے نگاہ
جُنون و حُسن کو باہم مِلا رہا ہے قمر
کسی کا رُوئے مُبیں پھر رہا ہے آنکھوں میں
رُلا رُلا کے مجھے مسکرا رہا ہے قمر

بُھلا رہا تھا جسے میں فریب دے دے کر
وہی حکایتِ شیریں سُنا رہا ہے قمر

چھپا رکھا تھا زمانے کی آنکھ سے جس کو
وہ دولتِ غمِ اُلفت لُٹا رہا ہے قمر

فلک پہ ابر کے اُڑتے ہوئے جزیروں میں
زمیں کے درد کو اوپر بُلا رہا ہے قمر

یہ کس غریب کے سینے میں ہُوک اُٹھتی ہے
لرز رہے ہیں محل تھر تھرا رہا ہے قمر

اُداس رات ہے افلاس ہے غلامی ہے
کفن سے مُنہ کو نکالے ڈرا رہا ہے قمر

کہاں ہے ساقیٔ گُل رُو کہاں ہے "سرخ شراب"
فسانۂ غمِ گیتی سُنا رہا ہے قمر

اب ایسی آندھیاں آنے کو ہیں بدبخت عالم میں
قفس کا ذکر کیا، سارا چمن اُڑ جانے والا ہے

رُوحِ فغفور

دُخترِ خواجگی رُوح غارت گری
موت کی ہم سفر مرگھٹوں کی پری
جہل و افلاس کے تخت پر جلوہ گر
کچھ پُجاری اِدھر کچھ پُجاری اُدھر
وہ شب اندام وہ قبر کی تیرگی
میرے گھر میں وہ کل یک بہ یک گھس گئی
ناچتی ، کودتی ، شور کرتی ہوی
میری خوشیوں سے جیبوں کو بھرتی ہوی

پرچمِ غم ہوا میں نچاتی ہوی
مسکراتی ہوی کِھل کھلاتی ہوی

ایڑیوں سے دِلوں کو کچلتی ہوی
خون پی پی کے گِرتی اُبھرتی ہوی

مَوت سے کہہ رہی تھی وہ یوں دم بہ دم
اے مری ہم نفَس اے مری ہم قدم

تیرے ترکش میں کیا ہے جو مجھ میں نہیں
کون سی وہ بَلا ہے، جو مجھ میں نہیں

کیا مجھے جُوعِ ارضی نے پالا نہیں
کیا یہ انسان میرا نوالا نہیں

پُشتِ گیتی پہ میں بھی تو ناسوُر ہوں
دیکھ تو کون ہوں رُوحِ فغفور ہوں

آتش کدہ

کیا کہوں کن دلبرانِ خاص کی محفل میں ہوں
کیا بتاؤں کن نگاہوں میں ہوں کیسے دل میں ہوں

واجب و امکان کی کس حد میں ہوں میں کیا کہوں
کیسی کیسی بجلیوں کی زد میں ہوں میں کیا کہوں

کتنے لب کتنی جبینیں کتنے جلوے کتنے طُور
کتنی صبحوں کا اُجالا کتنے نغموں کا سرُور

کتنی نو آغاز کلیاں، کتنے خوش بُودار پھول
میری ٹھنڈی سانس پر ہوتے ہیں رنجور و ملول

کتنے سنگیں دل ہیں جو میرے نشے میں چوُر ہیں
کتنی راتیں ہیں جو میرے نام سے مشہور ہیں

کیا کہوں کن مہوشوں کن دلبروں کا ساتھ ہے
کیا کہوں کن عارضوں کن کاکلوں کا ساتھ ہے

کیسے کیسے آتشیں پیغمبروں کا ساتھ ہے

گھر

گھر کے ہر ذرّے سے ناسور کی بُو آتی ہے
قبر کی، عُود کی، کافور کی بُو آتی ہے

ہم اسیروں کی بھی اک عمر بسر ہوتی ہے
نہ تو موت آتی ہے ہمدم نہ سحر ہوتی ہے

پشیمانی

اے خوشا وہ دن کہ جب تجھ سے ملاقاتیں نہ تھیں
ایسے مشکل دن نہ تھے ایسی کٹھن راتیں نہ تھیں

جب دلِ نادان یوں بے طرح بھر آتا نہ تھا
آتشِ غم تیز کرنے والی برساتیں نہ تھیں

شب کے سنّاٹے میں چپکے چپکے رو لینا نہ تھا
آنکھ میں آنسو نہ تھے لب پر مناجاتیں نہ تھیں

جب حریمِ دل میں روشن ہی نہ تھے غم کے چراغ
چاندنی راتیں تھیں، ایسی چاندنی راتیں نہ تھیں

زُلفِ چلیپا

آفریں ہے تجھ پہ اے سرمایہ داری کے نظام
اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کا اِتنا اہتمام
آندھیاں شعلہ بداماں خون کی برسات ہیں
اب تو بوئے آتش و بارود ہے ہر بات میں
کتنی ماؤں کی سہانی گودیاں ویراں ہیں آج
فرقِ گیتی پر نظر آتا ہے پھر کانٹوں کا تاج
موت محوِ شادمانی ، غرقِ ماتم ہے حیات
لُٹ رہی ہے ساری خلقت جل رہی ہے کائنات
جس زمیں سے ارتقا کے انبیا پیدا ہوے
جس زمیں سے علم و حکمت کے خدا پیدا ہوے

رام و لچھمن کی زمیں کرشنؑ ، گوتم کی زمیں
وہ محمّدؐ کی زمیں وہ ابنِ مریمؑ کی زمیں

اس زمیں کے ہر نشیلے بام و در میں موت ہے
اس کے دل میں موت ہے اس کی نظر میں موت ہے

مندروں میں معبدوں میں اور کلیساؤں میں موت
خَلوتوں میں مَوت ہے، شاہی شبستانوں میں موت

زر گری کا رقص ہے سُود و زیاں کا رقص ہے
ہر گلی کوچے میں مرگِ ناگہاں کا رقص ہے

اب کسی سینے میں روحِ شادماں گاتی نہیں
زندگی کی اب کہیں ہلچل نظر آتی نہیں

برہمی زلفِ چلیپا میں کبھی دیکھی نہ تھی
برہمی دیکھی تھی ، ایسی برہمی دیکھی نہ تھی

پی اور اپنے ہاتھ سے پی ، لے کے سرمائے کا نام
موت کا لبریز ساغر ، عصرِ حاضر کے غلام

عزمِ آزادی سلامت ، زندگی پائندہ باد
سُرخ پرچم اور اونچا ہو ، بغاوت زندہ باد

سپاہی

(یہ نظم دوسری عالمی جنگ کے سامراجی دور میں لکھی گئی تھی)

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

کون دُکھیا ہے جو گا رہی ہے
بھوکے بچوں کو بہلا رہی ہے
لاش جلنے کی بُو آ رہی ہے
زندگی ہے کہ چِلّا رہی ہے

جانے والے سپاہی سے پُوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

کتنے سہمے ہوئے ہیں نظارے
کیسا ڈر ڈر کے چلتے ہیں تارے
کیا جوانی کا خوں ہو رہا ہے
سُرخ ہیں آنچلوں کے کنارے

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

گِر رہا ہے سیاہی کا ڈیرا
ہو رہا ہے مری جاں سویرا
او وطن چھوڑ کر جانے والے!
کھُل گیا انقلابی پھریرا

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

اِنقلاب

(آنے والے نئے نظامِ عالم کے پیش رس کی تمنّائیں)

اے جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجومِ شوق سرِ رہگذار کب سے ہے
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

نہ تابناکیٔ رُخ ہے نہ کاکلوں کا ہجوم
ہے ذرّہ ذرّہ پریشاں کلی کلی مغموم
ہے کُل جہاں متعفّن ہوائیں سب مسموم
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

رخِ حیات پہ کاکُل کی برہمی ہی نہیں
نگارِ دہر میں اندازِ مرمی ہی نہیں
مسیحؑ و خضر کی کہنے کو کچھ کمی ہی نہیں
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

حیات بخش ترانے اَسیر ہیں کب سے
گلوئے زہرہ میں پیوست تیر ہیں کب سے
قفس میں بند ترے ہم صفیر ہیں کب سے
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

حرم کے دوش پہ عقبیٰ کا دام ہے اب تک
سروں میں دین کا سودائے خام ہے اب تک
توہّمات کا آدم غلام ہے اب تک
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

ابھی دماغ پہ قحبائے سیم و زر ہے سوار
ابھی رُکی ہی نہیں تیشہ زن کے خون کی دھار
شمیمِ عدل سے مہکیں یہ کوچۂ و بازار
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

اندھیرا

رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریُوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے یہ دَمکتا ہوا چاند
بھیک کے نُور میں مانگے کے اُجالے میں مگن
یہی ملبوسِ عروسی ہے یہی اِن کا کفن
اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جِسموں کی کراہ
وہ عزازیل کے کتّوں کی کمیں گاہ
"وہ تہذیب کے زخم"
خندقیں
باڑھ کے تار
باڑھ کے تاروں میں اُلجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ

وہ تڑختے ہوے سر
میّتیں ہات کٹی پاؤں کٹے
لاش کے ڈھانچے کے اِس پار سے اُس پار تلک
سرد ہوا
نوحۂ و نالہ و فریاد کُناں
شب کے سنّاٹے میں رونے کی صدا
کبھی بچوں کی کبھی ماؤں کی
چاند کے تاروں کے ماتم کی صدا
رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

جنگِ آزادی

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

ہم ہند کے رہنے والوں کی محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی دہقانوں کی مزدوروں کی

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

سارا سنسار ہمارا ہے پورب، پچھم، اُتّر، دکن
ہم افرنگی، ہم امریکی ہم چینی جاں بازانِ وطن
ہم سرخ سپاہی، ظلم شکن آہن پیکر فولاد بدن

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

ہم ہند کے رہنے والوں کی محکوموں کی ، مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی دہقانوں کی مزدوروں کی

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

وہ جنگ ہی کیا وہ امن ہی کیا؟ دشمن جس میں تاراج نہ ہو
وہ دُنیا دُنیا کیا ہوگی؟ جس دُنیا میں سوراج نہ ہو
وہ آزادی ، آزادی کیا؟ مزدور کا جس میں راج نہ ہو

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

ہم ہند کے رہنے والوں کی محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی دہقانوں کی مزدوروں کی

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

لو سُرخ سویرا آتا ہے آزادی کا آزادی کا
گلنار ترانہ گاتا ہے آزادی کا آزادی کا
دیکھو پرچم لہراتا ہے آزادی کا آزادی کا

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

سِتارے

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو
جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ
رات رات بھر جاگ جاگ کر
کس کو گیت سناتے ہو
چُپ چُپ رہ کر جھل مِل جھل مِل
کس بھاشا میں گاتے ہو

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو
جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ
رات اندھیری کالی کالی
کس سج دھج سے آئی ہے
میرا کیا ہے میں سودائی
تاروں کی رسوائی ہے

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو
جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ

ہم جس نگری میں رہتے ہیں
وہ نگری کیا دیکھو گے

غم جس بستی میں بستے ہیں
وہ بستی کیا دیکھو گے

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو
جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ

آپ تن آساں، راج دلارے
ہیں وحشی طوفان بدوش

میری دُنیا، جدلِ مسلسل
آپ کی دنیا سیلِ خموشی

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو
جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ

جھُوم جھُوم کر، گرج گرج کر
بادل بن کر چھانا ہے

دھرتی کے پیاسے ہونٹوں
میں امرت رس برسانا ہے

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو
جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ

اِستالین

(قازقستان کے نوّے سالہ بوڑھے تاتاری شاعر جمبول جابر کی نظم کا آزاد ترجمہ)

جابرؔ انقلابِ روس سے قبل کا انقلابی شاعر ہے، جس کا رنگ آج تک بدستور قائم ہے، اس کی نظموں کے مجموعے کا اٹھارہ زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے اور گورکی ایسے ادیب نے اس مجموعے کو مرتّب کیا ہے۔

صفِ اعدا کے مقابل ہے ہمارا رہبر
اِستالین
مادرِ روس کی آنکھوں کا درخشاں تارا
جس کی تابانی سے روشن ہے زمیں
وہ زمیں اور وہ وطن
جس کی آزادی کا ضامن ہے شہیدوں کا لہُو
جس کی بنیادوں میں جمہور کا عرق
ان کی محنت کا اخوّت کا محبّت کا خمیر

وہ زمیں
اس کا جلال
اس کا حشم
کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنّت کو جہنم کے حوالے کر دوں
کیا مجاہد نہ بنوں؟
کیا میں تلوار اُٹھاؤں نہ وطن کی خاطر
میرے پیارے مرے فردوس بدن کی خاطر
ایسے ہنگامِ قیامت میں مرا نغمۂ شوق
کیا مرے ہم وطنوں کے دل میں
زندگی اور مسرت بن کر
نہ سما جائے گا؟
قرّۃ العین! مری جانِ عزیز
او مرے فرزندو!
برق پا، وہ مرا رہوار کہاں ہے لانا
تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا
مرے نغمے تو وہاں گونجیں گے
ہے مرا قافلہ سالار جہاں اِستالین

وہ مِرا ملکِ جواں

وہ مرا بادۂ احمر کا جواں سال سبُو
میری نوخیز مسرت کا جہاں
وہ مرا سروِ رواں مُلکِ جواں
وَلدُ الجُرم خطا کار درندوں نے جہاں
اپنے ناپاک اِرادوں سے قدم رکھا ہے
ایک نوخیز کلی ـــــ ایک نو آغاز بشر
وہ مرا ملکِ جواں
سچ کہا ہے کہ "زمیں کے کیڑے
اپنی بے وقتِ اَجل سے ڈر کر
تھرتھراتے ہوئے سہمے ہوئے گھبرائے ہوئے
نکل آئے ہیں بِلوں سے باہر"
اپنے فولاد سے روزن کے دَہن بند کرو
اور فاشست شِغالوں سے کہو
نغمۂ اول و آخر ہے ... یہی
قُرّۃُ العین ! مری جانِ عزیز
او مرے فرزندو !
برق پا وہ مرا رَہوار کہاں ہے لانا
تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا
میرے نغمے تو وہاں گونجیں گے
ہے مرا قافلہ سالار جہاں اِستالین

یہی محشر ہے، دو عالم کا تصادم ہے یہی
ایک پرانا عالم
ایک نیا
ایک مرتی ہوی بڑھیا کا لنگڑاتا ہوا پاؤں
ایک ڈھلتی ہوی چھاؤں
دوسرا ایک ابھرتے ہوے سینے کا شباب
تیز اور تند شراب
پیٹ سے رینگنے والے، یہ نجس اور ناپاک
سوسمار
دورِ وحشت کے درندے
موذی
دہنِ آز و ہلاکت کا شکنجہ لے کر
میرے شاہیں کے خلاف
رات دن ہیں کہ چلے آتے ہیں
نہیں جائیں گے کبھی رائیگاں میرے نغمے
اور مرے ہم وطنوں کے نغمے
میرے شاہین تو منصور و مظفّر ہی رہیں گے دائم
سوسمارانِ خزندہ درگور
میرا شاہین، مرا استالین
میرے شاہین بچے، جن کا ابھی نام نہیں

سُرخرُو اور سرافراز فضاؤں میں بلند
ہاں مرے ہم وطنو
جاؤ اور اپنے سمندوں کو تو مہمیز کرو
سرخ فوجوں میں مِلو
جوئے پرجوش بنو، برق کا سیلاب بنو اور بہو
اک دہکتے ہوئے پگھلے ہوئے لوہے کا سمندر بن کر
غضب آلود بھنور بن جاؤ
اور فاشسٹ خنازیر کو
فی النار کرو
میرے بلخاش کہاں ہے وہ مِس سُرخ ترا
اس سے کہنا سرِ دشمن پہ گرے شل بن کر
بحرِ اخضر کے او ماہی گیرو! غوطہ زنو
اپنا ذخیرہ لاؤ
اور قربانِ وطن کر ڈالو
معدنوں سے کہو اور کھیتوں کو آواز تو دو
لائیں وہ اپنے سن و سال کا حاصل لائیں
اور قُربانِ وطن کر ڈالیں
یہ ہیں رَہوار یہ پشمینہ ہے، یہ خرمن ہیں
میرے محبوب وطن

سب کے سب تیرے ہیں سب تیرے ہیں
ایستالین نے میداں میں بُلایا ہے ہمیں
کسب اور جہد کا پیغام سنایا ہے ہمیں
خطۂ قدس سے دشمن کو نکالو باہر
قازقستان!
وطن!
اپنی طاقت کو سمیٹے ہوئے اُٹھ
خیز با صد حشم و جاہ و جلال
بہ ہزاراں جبروت
ایک جان ایک جسد
پھونک دے دشمنِ ناپاک کی خاکستر کو

جانبازانِ کیوّر

(مالابار کے چار کمیونسٹ کسان جنھیں اپریل ۱۹۴۳ء میں پھانسی دی گئی)

السّلام السّلام ـــــ
السّلام اے سُرخ جانبازانِ کیوّر السّلام
ہاں بڑھے گا زندگی کا کاروانِ تیز گام ـــــ السّلام
لیں گے ہم لیں گے شہیدوں کے لہو کا انتقام ـــــ السّلام
عہد کرتے ہیں مٹادیں گے یہ سولی کا نظام ـــــ السّلام
آلِ لینن آلِ استالین کا زندہ ہے نام ـــــ السّلام
ہاں بڑھے گا زندگی کا کاروانِ تیز گام
السّلام السّلام

السّلام اے سُرخ جانبازانِ کیوّر السّلام

بنگال

ایک ہو کر دُشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خُون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم
کانگریس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم

وہ درِ ہندوستاں وہ سحر و نغمہ کا دیار
دیدنی ہے آج اس کی ناتوانی کی بہار
بھوک کا بیماریوں کا بم کے گولوں کا شکار
پیٹھ میں جاپان کا خنجر تو سر پر سُود خوار

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خُون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم
کانگریس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم

قبر کے روزن سے اپنا سر نکالا موت نے
بے سہارا جان کر مارا ہے بھالا موت نے
خاندانوں کو بنا ڈالا نوالا موت نے
شیر خواروں کو چبا کر تھوک ڈالا موت نے

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم
کانگرس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم

اُمتِ مرحوم ہو یا ملتِ زُنّار دار
اُن کے فاقوں کی نہ گنتی ہے نہ لاشوں کا شمار
مردِ و زن، شیخ و برہمن سب قطار اندر قطار
آہ سوکھی چھاتیوں کی چیخ، بچوں کی پُکار

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم
کانگرس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم

آج اپنا گھر عدو کی رہگذر ہی کیوں نہ ہو
ہم بڑھے جائیں گے رستہ پُر خطر ہی کیوں نہ ہو

ہم لٹے جائیں گے دشمن بدگُہر ہی کیوں نہ ہو
اپنی وردی خاک و خوں میں تربتر ہی کیوں نہ ہو

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خُون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم
کانگرس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم

تماشائی

اِدھر آ، اے مرے ناداں تماشائی اِدھر آ

نہیں ہے ہم میں کوئی آلِ قیصر، آلِ عثمانی
نہیں ہے گنجِ قاروں، تختِ جم، تختِ سلیمانی
نہ ہم میں طغرل و سنجر نہ ہم میں ظلِّ سبحانی
خدا سویا ہوا ہے جل رہی ہے شمعِ شیطانی

نہیں رکھتے ہیں کچھ بھی، نورِ عرفانی تو رکھتے ہیں
محل رکھتے نہیں ہیں، زورِ طغیانی تو رکھتے ہیں

اِدھر آ، اے مرے ناداں تماشائی اِدھر آ

تلنگانہ

دیارِ ہند کا وہ راہبر تلنگانہ
بنا رہا ہے نئی اِک سحر تلنگانہ
بُلا رہا ہے بہ سمتِ دِگر تلنگانہ
وہ اِنقلاب کا پیغامبر تلنگانہ

امامِ تشنہ لباں خضرِ راہِ آبِ حیات
اندھیری رات کے سینے میں مشعلوں کی برات
مرا ثبات، مری کائنات، میری حیات
سلام مہرِ بغاوت، سلام ماہِ نجات

سیاہ رات جرائم پناہ، ظلم بدوش
سیاہ رات میں بدکار مست اور مدہوش
سیاہ رات میں مقتول عصمتوں کا خروش
سیاہ رات میں باغی عوام برق بدوش

اُٹھے ہیں تیغ بکف یوں بصد ہزار جلال
وہ کوہ و دشت کے فرزند کھیتوں کے لال
چمک رہی ہے درانتی اُچھل رہے ہیں کدال
بنائے قصرِ امارت شکستہ و پامال

لرز لرز کے گرے سقف و بام زرداری
ہے پاش پاش نظامِ ہلاکو و زاری
پڑی ہے فرقِ مبارک پہ ضربتِ کاری
حضورِ آصفِ سابع پہ ہے غشی طاری

بدل رہی ہے یہ رنج و عذاب کی دُنیا
اُبھر رہی ہے نئے آفتاب کی دُنیا
نئے عوام، نئی آب و تاب کی دُنیا
وہ رنگ و نور کی محفل، شباب کی دُنیا

سلام سُرخ شہیدوں کی سرزمین سلام
سلام عزمِ بلند، آہنی یقین سلام
مجاہدوں کی چمکتی ہوئی جبین سلام
دیارِ ہند کی محبوب ارضِ چین سلام

قید ہے قید کی میعاد نہیں
جَور ہے جَور کی فریاد نہیں، داد نہیں
رات ہے رات کی خاموشی ہے تنہائی ہے
دُور محبس کی فصیلوں سے بہت دُور کہیں
سینۂ شہر کی گہرائی سے گھنٹوں کی صدا آتی ہے
چونک جاتا ہے دماغ
جِھلملا جاتی ہے اَنفاس کی لَو
جاگ اُٹھتی ہے مری شمعِ شبستانِ خیال
زندگانی کی اک اک بات کی یاد آتی ہے
شاہ راہوں میں گلی کوچوں میں اِنسانوں کی بِھیڑ

اُن کے مصروف قدم
اُن کے ماتھے پہ تردّد کے نقوش
اُن کی آنکھوں میں غمِ دوش اور اندیشۂ فردا کا خیال
سیکڑوں لاکھوں قدم
سیکڑوں لاکھوں عوام
سیکڑوں لاکھوں دھڑکتے ہوئے اِنسانوں کے دِل
جورِ شاہی سے غمیں، جبرِ سیاست سے نڈھال
جانے کس موڑ پہ یہ دَھن سے دھماکا ہو جائیں
سالہا سال کی افسردہ و مجبور جوانی کی اُمنگ
طوق و زنجیر سے لپٹی ہوئی سو جاتی ہے
کروٹیں لینے میں زنجیر کی جھنکار کا شور
خواب میں زیست کی شورش کا پتہ دیتا ہے
مجھے غم ہے کہ مرا گنجِ گراں مایۂ عمر
نذرِ زنداں ہوا
نذرِ آزادیٔ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا

(سنٹرل جیل حیدر آباد دکن)

نیا چینؔ

اِنساں کی آرزو نے اِنساں کی جستجو نے

گِرتی ہوی زمیں کو آکاش میں اُچھالا

وہ موڑ آگیا ہے مشرق کی زندگی میں

ہر گام پر سویرا، ہر سُو نیا اُجالا

ماسکو

ہند کی دُکھیاری جنتا کا سلام لے لے
پیام لے لے
میرے ساتھی ماسکو
سات نومبر کی جیوتی سے ہم نے رستہ پایا
ہم نے اپنا خون بہا کر تجھ سے ہاتھ مِلایا
جگت کی جنتا سے مِل جُل کر جیون گیت بنایا
تیرے نام سے تیرے کام سے ہر سُو دیپ جلایا
ہند کی دُکھیاری جنتا کا سلام لے لے
پیام لے لے
میرے ساتھی ماسکو

(ماسکو کے ہوائی اڈّے پر اُترتے ہوے)

چارہ گر

اِک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دُور اُس موڑ پر
دو بدن
پیار کی آگ میں جل گئے
پیار حرفِ وفا
پیار اُن کا خدا
پیار اُن کی چِتا
دو بدن
اوس میں بھیگتے، چاندنی میں نہلتے ہوے
جیسے دو تازہ رُو تازہ دم پھول پچھلے پہر
ٹھنڈی ٹھنڈی سُبک رَو چمن کی ہوا
صرفِ ماتم ہوی
کالی کالی لٹوں سے لپٹ گرم رُخسار پر
ایک پَل کے لیے رُک گئی

ہم نے دیکھا انھیں
دن میں اور رات میں
نور و ظلمات میں

مسجدوں کے مناروں نے دیکھا اُنھیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا اُنھیں
میکدوں کی دراڑوں نے دیکھا اُنھیں
اَز اَزل تا اَبد
یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبّت بھی ہے
کچھ علاج و مداوائے اُلفت بھی ہے ؟

اک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دُور اُس موڑ پر
دو بدن
چارہ گر !

آج کی رات نہ جا

رات آئی ہے بہت راتوں کے بعد آئی ہے
دیر سے دور سے آئی ہے مگر آئی ہے
مرمریں صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آئے گا
رات ٹوٹے گی اُجالوں کا پیام آئے گا
آج کی رات نہ جا

زندگی لُطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دِید بھی ہے حسرتِ دیدار بھی ہے
زہر بھی آبِ حیاتِ لب و رُخسار بھی ہے
زندگی دار بھی ہے زندگی دلدار بھی ہے
آج کی رات نہ جا

آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے
کتنی فرخندہ ہے شب، کتنی مبارک ہے سحر
وقف ہے میرے لیے تیری محبّت کی نظر
آج کی رات نہ جا

بھاگ متی

پیار سے آنکھ بھر آتی ہے کنول کھلتے ہیں
جب کبھی لب پہ ترا نامِ وفا آتا ہے

دشت کی رات میں بارات یہیں سے نکلی
راگ کی رنگ کی برسات یہیں سے نکلی
انقلابات کی ہر بات یہیں سے نکلی
گنگناتی ہوئی ہر رات یہیں سے نکلی

دَھن کی گھنگھور گھٹائیں ہیں نہ ہُن کے بادل
سونے چاندی کے گلی کوچے نہ ہیروں کے محل
آج بھی جسم کے انبار ہیں بازاروں میں
خواجۂ شہر ہے یُوسف کے خریداروں میں

شہر باقی ہے محبت کا نشاں باقی ہے
دِلبری باقی ہے دِلداریٔ جاں باقی ہے
سرِ فہرستِ نگارانِ جہاں باقی ہے
تو نہیں ہے تِری چشمِ نگراں باقی ہے

چاند تاروں کا بَن

(آزادی سے پہلے ، بعد اور آگے)

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تَن
رات بھر جھلملاتی رہی شمعِ صبحِ وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بَن
تشنگی تھی مگر

تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مَرد و زَن
مستیاں ختم، مدھوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن
رات کے جگمگاتے دہکتے بدن

صُبح دم ایک دیوارِ غم بن گئے
خارزارِ اَلم بن گئے
رات کی شہ رگوں کا اُچھلتا لہو
جُوئے خوں بن گیا

کچھ اِمامانِ صد مکر و فن
اُن کی سانسوں میں اَفعی کی پُھنکار تھی
ان کے سینے میں نفرت کا کالا دُھواں
اک کمیں گاہ سے
پھینک کر اپنی نوکِ زباں
خونِ نورِ سحر پی گئے

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا بھی ہے
صبح کا کچھ اُجالا، اُجالا بھی ہے
ہمدمو!
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

—

رقص

وہ روپ رنگ راگ کا پیام لے کے آگیا
وہ کام دیو کی کمان ، جام لے کے آگیا

وہ چاندنی کی نرم نرم آنچ میں تپی ہوئی
سمندروں کے جھاگ سے بنی ہوئی جوانیاں
ہری ہری روش پہ ہم قدم بھی ہم کلام بھی

بدن مہک مہک کے چل
کمر لچک لچک کے چل
قدم بہک بہک کے چل
وہ روپ رنگ راگ کا پیام لے کے آگیا
وہ کام دیو کی کمان، جام لے کے آگیا

الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو

○

سیماب دشی، تشنہ لبی باخبری ہے
اس دشت میں گر رختِ سفر ہے تو یہی ہے

اک شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو
کم کم ہی سہی نسبتِ پیمانہ رہی ہے

بے صحبتِ رخسار اندھیرا ہی اندھیرا
گو جام وہی مے وہی میخانہ وہی ہے

اس عہد میں بھی دولتِ کونین کے باوصف
ہر گام پہ اُن کی جو کمی تھی سو کمی ہے

ہر دم ترے اَنفاس کی گرمی کا گماں ہے
ہر یاد تری یاد کے پھولوں میں بسی ہے

ہر شام سجائے ہیں تمنّا کے نشیمن
ہر صبح مئے تلخئ ایام بھی پی ہے

دھڑکا ہے دلِ زار ترے ذکر سے پہلے
جب بھی کسی محفل میں تری بات چلی ہے

وہ عطر تری کاکلِ شب رنگ نے چھڑکا
مہکی ہے خرد، روح کلی بن کے کھلی ہے

○

تیرے دیوانے تری چشم و نظر سے پہلے
دار سے گزرے تری راہ گزر سے پہلے
بزم سے دُور وہ گاتا رہا تنہا تنہا
سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے
اس اندھیرے میں اُجالوں کا گماں تک بھی نہ تھا
شعلہ رو شعلہ نوا، شعلہ نظر سے پہلے
کون جانے کہ ہو کیا رنگِ سحر رنگِ چمن
میکدہ رقص میں ہے پچھلے پہر سے پہلے
نکہتِ یار سے آباد ہے ہر کنجِ قفس
مِل کے آئی ہے صبا اُس گُلِ تر سے پہلے

○

دراز ہے شبِ غم سوز و ساز ساتھ رہے
مُسافرو! مۓ مینا گداز ساتھ رہے

قدم قدم پہ اندھیروں کا سامنا ہے یہاں
سفر کٹھن ہے، دمِ شعلہ ساز ساتھ رہے

یہ کوہ کیا ہے یہ دشتِ الم فزا کیا ہے
جو اک تری نگہِ دل نواز ساتھ رہے

کوئی رہے نہ رہے ایک آہ اِک آنسو
بصد خلوص، بصد امتیاز ساتھ رہے

یہ میکدہ ہے، نہیں سیرِ دیر، سیرِ حرم
نظر عفیف دلِ پاک باز ساتھ رہے

○

اُسی چمن میں چلیں جشنِ یادِ یار کریں
دِلوں کو چاک، گریباں کو تار تار کریں
شمیمِ پیرہنِ یار کیا نثار کریں
تجھی کو دل سے لگا لیں تجھی کو پیار کریں
سُناتی پھرتی ہیں آنکھیں کہانیاں کیا کیا
اب اور کیا کہیں کس کس کو سوگوار کریں
اُٹھو کہ فرصتِ دیوانگی غنیمت ہے
قفس کو لے کے اُڑیں گُل کو ہمکنار کریں
کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل
تمام رات غزل گائیں دیدِ یار کریں

○

پھر بُلا بھیجا ہے پھولوں نے گلستانوں سے
تم بھی آجاؤ کہ باتیں کریں پیمانوں سے
رُت پلٹ آئے گی اِک آپ کے آجانے سے
کتنے افسانے ہیں، سننے ہیں جو دیوانوں سے
تحفۂ برگِ گل و بادِ بہاراں لے کر
قافلے عشق کے نکلے ہیں بیابانوں سے
بدلا بدلا سا نظر آتا ہے، دنیا کا چلن
آپ کے ملنے سے، ہم جیسے پریشانوں سے
ہم تو کِھلتے ہوئے غنچوں کا تبسّم ہیں ندیم
مُسکراتے ہوئے ٹکراتے ہیں طوفانوں سے

○

سحر سے رات کی سرگوشیاں بہار کی بات
جہاں میں عام ہوئی چشمِ انتظار کی بات
دِلوں کی تشنگی جتنی، دِلوں کا غم جتنا
اُسی قدر ہے زمانے میں حُسنِ یار کی بات
جہاں بھی بیٹھے ہیں جس جا بھی رات مے پی ہے
اُنھیں کی آنکھوں کے قصے اُنھیں کے پیار کی بات
چمن کی آنکھ بھر آئی، کلی کا دِل دھڑکا
لبوں پہ آئی ہے جب بھی کسی قرار کی بات
یہ زرد زرد اُجالے یہ رات رات کا درد
یہی تو رہ گئی اب جانِ بے قرار کی بات
تمام عمر چلی ہے، تمام عمر چلے
الٰہی ختم نہ ہو یارِ غم گسار کی بات

○

یہ کون آتا ہے تنہائیوں میں جام لیے
جِلو میں چاندنی راتوں کا اہتمام لیے
چٹک رہی ہے کہیں یاد کی کلی دل میں
نظر میں رقصِ بہاراں کی صبح و شام لیے
ہجومِ بادہ و گُل میں، ہجومِ یاراں میں
کسی نگاہ نے جُھک کر مرے سلام لیے
کسی خیال کی خوشبو کسی بدن کی مہک
درِ قفس پہ کھڑی ہے صبا پیام لیے
مہک مہک کے جگاتی رہی نسیمِ سحر
لبوں پہ یارِ مسیحا نفس کا نام لیے
بجا رہا تھا کہیں دُور کوئی شہنائی
اُٹھا ہوں، آنکھوں میں اک خوابِ ناتمام لیے

○

سازآہستہ ذرا گردشِ جام آہستہ
جانے کیا آئے نگاہوں کا پیام آہستہ
چاند اُترا کہ اُتر آئے ستارے دل میں
خواب میں ہونٹوں پہ آیا ترا نام آہستہ
کوئے جاناں میں قدم پڑتے ہیں ہلکے ہلکے
آشیانے کی طرف طائرِ بام آہستہ
ان کے پہلو کے مہکتے ہوئے شاداں جھونکے
یوں چلے جیسے شرابی کا خرام آہستہ
اور بھی بیٹھے ہیں اے دل ذرا آہستہ دھڑک
بزم ہے پہلو بہ پہلو ہے کلام آہستہ
یہ تمنّا ہے کہ اُڑتی ہوی منزل کا غبار
صبح کے پردے میں یا آگئی شام آہستہ

جانِ غزل

اے دلِ نارسا آج اتنا مچل
مست آنکھوں کی جھیلوں میں کِھلنے لگیں آنسوؤں کے کنول
مل گیا راہ میں اجنبی موڑ پر کوئی جانِ غزل
آج تو یاد آئیں نہ دُنیا کے غم
آج دل کھول کر مُسکرا چشمِ نم
آج چھٹکی ہے رُخسار کی چاندنی
چھَٹ گئیں بدلیاں، کھُل گئے پیچ و خم
کتنا بھاری تھا یہ زندگی کا سفر
میری جانِ غزل
خوابِ فردا کی دیوار کی چھاؤں میں
دو گھڑی بیٹھ کر
عشرتِ حال کی مے پیئں
راستے منتظر، گُل بداماں ہے ہر رہ گزر
دل کی سنسان گلیوں میں کچھ دیر کچھ دور تک
آج تو ساتھ چل

پیار کی چاندنی

ہدیۂ اشک خوں لے کے آیا ہوں میں
خوں بہائے وفا! دل کی سوغات کیا
جیب و داماں کی اڑنے لگیں دھجیاں
جرم کیا، جرمِ غم کی مکافات کیا
عشق کی مشعلیں، عشق کے ولولے
ہم سفر، صبح کیا، شام کیا، رات کیا
چشمِ اہلِ ہوس مسکراتی ہے گر
چشمِ اہلِ ہوس مسکراتی رہے
ابنِ آدم کو سُولی چڑھاتے رہو
زندگانی سرِ دار گاتی رہے
یادِ یاراں میں اک جامِ غم اور دو
رات کی تیرگی سوز گاتی رہے
دل بڑھاتی رہیں ہاتھ کی نرمیاں
پیار کی چاندنی جگمگاتی رہے

○

اَب کہاں جا کے یہ سمجھائیں کہ کیا ہوتا ہے
ایک آنسو جو سرِ چشمِ وفا ہوتا ہے
اس گزرگاہ میں اس دشت میں اے جذبۂ عشق
جُز ترے کون یہاں آبلہ پا ہوتا ہے
دل کی محراب میں اک شمع جَلی تھی سرِ شام
صبح دم ماتمِ اربابِ وفا ہوتا ہے
دیپ جلتے ہیں دلوں میں کہ چِتا جَلتی ہے
اب کی دیوالی میں دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے
جب برستی ہے تری یاد کی رنگین پھوار
پھول کِھلتے ہیں درِ میکدہ وا ہوتا ہے

○

روشن ہے بزم شعلہ رُخاں دیکھتے چلیں
اس میں وہ ایک نورِ جہاں دیکھتے چلیں
وا ہو رہی ہے میکدۂ نیم شب کی آنکھ
انگڑائی لے رہا ہے جہاں دیکھتے چلیں
سرگوشیوں کی رات ہے، رُخسار ولب کی رات
اب ہو رہی ہے رات جواں دیکھتے چلیں
دِل میں اُتر کے سیرِ دلِ رہرواں کریں
آہوں میں ڈھل کے ضبطِ فغاں دیکھتے چلیں

کیسے ہیں خانقاہ میں اربابِ خانقاہ
کس حال میں ہے پیرِ مغاں دیکھتے چلیں
ماضی کی یادگار سہی یادِ دل تو ہے
طرزِ نشاطِ نوحہ گراں دیکھتے چلیں
سب وسوسے ہیں گردِ رہِ کارواں کے ساتھ
آگے ہے مشعلوں کا دُھواں دیکھتے چلیں
آنچل سے اُڑ رہے ہیں فضاؤں میں دُور دُور
شاید وہیں ہو جانِ بُتاں دیکھتے چلیں
آ ہی گئے ہیں رقص گہِ گل رُخاں میں ہم
کچھ رنگ و بُو کا سیلِ رواں دیکھتے چلیں

○

بڑھ گیا بادۂ گُلگُوں کا مزا آخرِ شب
اور بھی سُرخ ہے رُخسارِ حیا آخرِ شب

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے
اور چمکا ترا نقشِ کفِ پا آخرِ شب

کھٹکھٹا جاتا ہے زنجیرِ درِ میخانہ
کوئی دیوانہ کوئی آبلہ پا آخرِ شب

سانس رُکتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی
کوئی لیتا تھا ترا نامِ وفا آخرِ شب

گُل ہے قندیلِ حرم، گُل ہیں کلیسا کے چراغ
سوئے پیمانہ بڑھے دستِ دُعا آخرِ شب

ہائے کس دھوم سے نکلا ہے شہیدوں کا جلوس
جُرم چپ، سر بہ گریباں ہے جفا آخرِ شب

اُسی انداز سے پھر صبح کا آنچل ڈھلکے
اُسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب

○

وہ جو چھپ جاتے تھے کعبوں میں صنم خانوں میں
ان کو لا لا کے بٹھایا گیا دیوانوں میں

فصلِ گُل ہوتی تھی کیا جشنِ جنوں ہوتا تھا
آج کچھ بھی نہیں ہوتا ہے گلستانوں میں

آج تو تلخیٔ دوراں بھی بہت ہلکی ہے
گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

آج تک طنزِ محبّت کا اثر باقی ہے
قہقہے گونجتے پھرتے ہیں بیابانوں میں

وصل ہے اُن کی اَدا ہجر ہے ان کا انداز
کون سا رنگ بھروں عشق کے افسانوں میں

شہر میں دھوم ہے اک شعلہ نوا کی مخدومؔ
تذکرے رستوں میں، چرچے ہیں پری خانوں میں

○

پھر چھڑی رات بات پھُولوں کی
رات ہے یا بَرات پھُولوں کی
پھول کے ہار، پھول کے گجرے
شام پھولوں کی، رات پھولوں کی
آپ کا ساتھ، ساتھ پھولوں کا
آپ کی بات، بات پھولوں کی
نظریں ملتی ہیں، جام ملتے ہیں
مل رہی ہے حیات پھولوں کی
کون دیتا ہے جان پھولوں پر
کون کرتا ہے بات پھولوں کی

وہ شرافت تو دِل کے ساتھ گئی
لُٹ گئی کائنات پھولوں کی
اب کِسے ہے دماغِ تہمتِ عشق
کون سُنتا ہے بات پھولوں کی
میرے دل میں سرورِ صبحِ بہار
تیری آنکھوں میں رات پھولوں کی
پھول کِھلتے رہیں گے دُنیا میں
روز نکلے گی بات پھولوں کی
یہ مہکتی ہوئی غزل مخدومؔ
جیسے صحرا میں رات پھولوں کی

اُسی ادا سے اُسی بانکپن کے ساتھ آؤ
پھر ایک بار اُسی انجمن کے ساتھ آؤ
ہم اپنے ایک دلِ بے خطا کے ساتھ آئیں
تم اپنے محشرِ دار و رسن کے ساتھ آؤ

○

تم گلستاں سے گئے ہو تو گلستاں چُپ ہے
شاخِ گُل کھوئی ہوی مرغِ خوش الحاں چُپ ہے
اُفقِ دل پہ دکھائی نہیں دیتی ہے دھنک
غمزدہ موسمِ گُل ، ابرِ بہاراں چُپ ہے
عالمِ تشنگیٔ بادہ گساراں مت پوچھ
میکدہ دُور ہے مینائے زرافشاں چُپ ہے
اور آگے نہ بڑھا قصّۂ دِل قصّۂ غم
دھڑکنیں چُپ ہیں سرشکِ سرمژگاں چُپ ہے
شہر میں ایک قیامت تھی ، قیامت نہ رہی
حشر خاموش ہوا ، فتنۂ دوراں چُپ ہے
نہ کسی آہ کی آواز ، نہ زنجیر کا شور!
آج کیا ہوگیا زِنداں میں کہ زنداں چُپ ہے

○

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
چشمِ نم مُسکراتی رہی رات بھر
رات بھر درد کی شمع جلتی رہی
غم کی لَو تھرتھراتی رہی رات بھر
بانسری کی سُریلی سُہانی صدا
یاد بن بن کے آتی رہی رات بھر
یاد کے چاند دل میں اُترتے رہے
چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر
کوئی دیوانہ گلیوں میں پھرتا رہا
کوئی آواز آتی رہی رات بھر

○

(امان مرحوم کے نام)

عشق کے شعلے کو بھڑکاؤ کہ کچھ رات کٹے
دِل کے انگارے کو دہکاؤ کہ کچھ رات کٹے
ہجر میں ملنے شبِ ماہ کے غم آئے ہیں
چارہ سازوں کو بھی بلواؤ کہ کچھ رات کٹے
کوئی جلتا ہی نہیں، کوئی پگھلتا ہی نہیں
موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے
چشم و رُخسار کے اذکار کو جاری رکھو
پیار کے نغمے کو دُہراؤ کہ کچھ رات کٹے
آج ہو جانے دو ہر ایک کو بدمست و خراب
آج ایک ایک کو پلواؤ کہ کچھ رات کٹے
کوہِ غم اور گراں، اور گراں، اور گراں
غمزدو تیشے کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے

○

زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی ، زندگی رنگِ گُل کا بیاں دوستو
گاہ روتی ہوئی، گاہ ہنستی ہوئی، میری آنکھیں ہیں افسانہ خواں دوستو
ہے اسی کے جمالِ نظر کا اثر ، زندگی زندگی ہے ، سفر ہے سفر
سایۂ شاخِ گُل، شاخِ گُل بن گیا، بن گیا ابر ، ابرِ رواں دوستو
اک مہکتی بہکتی ہوئی رات ہے، لڑکھڑاتی نگاہوں کی سوغات ہے
پنکھڑی کی زباں، پھول کی داستاں اُس کے ہونٹوں کی پرچھائیاں دوستو
کیسے طے ہوگی یہ منزلِ شامِ غم ، کس طرح سے ہو دل کی کہانی رقم
اک ہتھیلی میں دِل ، اک ہتھیلی میں جاں، اب کہاں کا یہ سُود و زیاں دوستو
دوستو ایک دو جام کی بات ہے، دوستو ایک دو گام کی بات ہے
ہاں اُسی کے در و بام کی بات ہے، بڑھ نہ جائیں کہیں دُوریاں دوستو
سُن رہا ہوں حوادث کی آواز کو ، پا رہا ہوں زمانے کے ہر راز کو
دوستو اُٹھ رہا ہے دلوں سے دھواں، آنکھ لینے لگی ہچکیاں دوستو

○

کچھ پھول سرِ صحنِ چمن کھل تو رہے ہیں
اک نور سرِ طور نظر آ تو رہا ہے
صدیوں سے صدف بند، گہُر بند، نظر بند
وہ جانِ صدف، جانِ گہُر آ تو رہا ہے
لب سرد، نظر سرد، بدن سرد ہے، دل سرد
وہ جانِ مسیحا نفساں آ تو رہا ہے
آنکھوں میں حیا، لب پہ ہنسی آ تو رہی ہے
آغوشِ سحر میں کوئی شرما تو رہا ہے

○

پھول کھلتے ہی رہے، کلیاں چٹکتی ہی رہیں
دل دھڑک جائے تو حاصل؟ آنکھ بھر آئی تو کیا
شام سلگاتی چلی آتی ہے زخموں کے چراغ
کوئی جام آیا تو کیا، کوئی گھٹا چھائی تو کیا
کاکلیں لہرائیں، راتیں مہکیں، پیراہن اُڑے
ایک اُن کی یاد ایسی تھی، نہیں آئی تو کیا
دُوریاں بڑھتی بھی ہیں، گھٹتی بھی ہیں، مٹتی بھی ہیں
ساعتیں آئیں، یہی ساعت نہیں آئی تو کیا

فاصلے

(کماری اندرا دھن راج گیرجی کی ایک انگریزی نظم
YEARNING کے مرکزی خیال سے متاثر ہو کر)

یہ مقدّر یہ مشیّت کہ مُلاقات ہُوی
بات ہونی تھی بہر حال وہی بات ہُوی
پر تُو انجان رہا میرے لیے
آج تک ایک معمّہ ہی رہا تیرا وجود
جانتا ہوں تو بہت دُور ہے پربت کی طرح
جو سرافراز درختوں میں کھڑا رہتا ہے تنہا تنہا
حلقۂ غم میں اکیلا تنِ تنہا تو بھی
دُور سے سَر کے اشاروں سے بُلاتا ہے مجھے
اسی پربت کی طرح
مجھے معلوم نہیں
مدّعا کیا ہے، ترے دل کی تمنّا کیا ہے
خود مرے درد کا درماں، مرا ارماں کیا ہے
مجھے معلوم نہیں

دل کو تسکین نہیں، رُوح کو آرام نہیں
عرصۂ دہر میں اک معرکہ آرائی ہے
بے طرح دست و گریباں ہے خرد اور جنُوں
دل کی گہرائی میں سُنتا ہوں ترے ساز کی دل گیر صدا
گونجتی ہے تری آواز مرے دل کے نہاں خانے میں
تجھ سے ملنے جو مرے دل نے پذیرائی کی
آنکھ بھر آئی چھلکنے لگا احساس کا جام
تُو جو مستُور بھی ہے دُور بھی ہے
جو سرافراز درختوں میں کھڑا رہتا ہے تنہا تنہا
دُور ...... پربت کی طرح
تُجھ سے لپٹا ہی رہا دُوریٔ منزل کا غُبار
تھرتھراتا ہی رہا تارِ نظر
جھلملاتی ہی رہی شمع امید
دل دھڑکتا ہی رہا
تُجھ سے کیا مانگوں بہ جُز حرفِ وفا
تجھ سے کیا چاہوں بہ جُز پاسِ نظر
آ اور اس تشنگیٔ دل کا مداوا کر دے
تُو جو مستُور بھی ہے دُور بھی ہے
جو سرافراز درختوں میں کھڑا رہتا ہے تنہا تنہا

دُور ..... پربت کی طرح

زندگی نوکِ سناں
زندگی مثلِ سناں، جسم میں جاں میں اُتر جاتی ہے
زندگی سود و زیاں
زندگی ایک دو دھاری تلوار
کاٹ دیتی ہے بہ یک جنبشِ لب
نفع و ضرر ، سُود و زیاں
پیار کٹ جاتے ہیں کٹ جاتی ہے جاں
حُسن کی جُوئے خُنک عشق کے شعلوں کی لپک
بُغض و نفریں و ملامت کے سبھی کوہِ گراں
بال کی طرح سے کٹ جاتے ہیں
زندگی نوکِ سِناں
زندگی ہے کہ بدلتا ہوا افلاک کا رنگ
چشمِ خُوباں ہے جو، سو رنگ میں ہے جلوہ نما
زندگی خوئے منافق، کبھی سایہ کبھی نُور
تُو کہ اک چشمۂ اخلاص، بُلاتا ہے مجھے
مَیں کہ اک بحرِ حقیقت کے مقابل ہوں ترے
تُو کہ یکتا بھی ہے، تنہا بھی ہے، بے بس بھی ہے

زندگی نوکِ سِناں

دل مقدّر ہے، مشیّت ہے وصال
راہ تکتا ہے مقدّر کہ ملے جسم سے جاں
راہ یوں تکتا ہے جیسے کسی اوتار و پیمبر کو ترستا ہو جہاں
ایک جاں
راندۂ درگاہِ حیات
اپنی تکمیلِ خودی میں متلاشی بھی ہے، بےتاب بھی ہے
گنگنائے بھی نہیں جاتے ہیں الفاظ کہ مرجاتے ہیں
شررِ زندگی بجھ جاتا ہے شعلہ نہیں ہونے پاتا
ارتقا کا یہی اک نکتۂ نایاب
یہی رازِ سرا پردۂ ذات
حاصلِ روز و شب و سلسلۂ موت و حیات
دشتِ فرقت میں تو بن جاتا ہے اک موجِ سراب
تو سرافراز درختوں میں کھڑا رہتا ہے تنہا تنہا
دُور ... پربت کی طرح
میں کہ درماندہ مُسافر ترے دروازے پر
مثلِ حباب
دستِ بےرحمیٔ دوراں کی عنایات کا مارا آیا
تیری آنکھوں میں جو ڈالیں آنکھیں

گتھیاں کھل گئیں
حل ہو گئے اسرارِ حیات
ایک ہی پل میں ملے
برقِ فنا آبِ حیات
تو سرافراز درختوں میں کھڑا رہتا ہے تنہا تنہا
آ اور آ کے حقیقت کے مقابل ہو جا

احساس کی رات

مجھے ڈر ہے کہ کہیں سرد نہ ہو جائے یہ احساس کی رات
نرغۂ طوفانِ حوادث کے، ہوس کی یلغار
یہ دھماکے، یہ بگولے، سرِ راہ
جسم کا جان کا پیمانِ وفا کیا ہوگا؟
تیرا کیا ہوگا مرے تارِ نفس
تیرا کیا ہوگا اے مضرابِ جنوں

یہ دہکتے ہوئے رُخسار
یہ مہکتے ہوئے لب
یہ دھڑکتا ہوا دل
شفقِ زیست کی پیشانی کا رنگیں قشقہ
کیا ہوگا
اُڑ نہ جائے کہیں یہ رنگِ جبیں
مٹ نہ جائے کہیں یہ نقشِ وفا
چُپ نہ ہو جائے یہ بجتا ہوا ساز
شمعیں اب کون جلائے گا، سرِ شام گزر گاہوں میں
دہر میں لطف و عطا کچھ بھی نہیں
دہر میں مہر و وفا کچھ بھی نہیں
سجدہ کچھ بھی نہیں نقشِ کفِ پا کچھ بھی نہیں
میرے دل اور دھڑک
شاخِ گل
اور مہک اور مہک اور مہک

○

فسوں کی رات میں اُڑتے ہوئے سے افسانے
یہ کاکلوں کی سلونی گھٹا رہے نہ رہے
کہ پھر یہ رات یہ ٹھنڈی ہوا رہے نہ رہے

○

بنتے رہے بگڑتے رہے کاروبارِ شوق
اک ہم کہ آرزو کا سہارا بنے رہے

چُپ نہ رہو

(لوممبا کے قتل پر)

شب کی تاریکی میں اک اور ستارہ ٹوٹا
طوق توڑے گئے، ٹوٹی زنجیر
جگمگانے لگا ترشے ہوے ہیرے کی طرح
آدمیّت کا ضمیر
پھر اندھیرے میں کسی ہاتھ میں خنجر چمکا

شب کے سنّاٹے میں پھر خون کے دریا چمکے
صبحِ دَم جب مرے دروازے سے گذری ہے صبا
اپنے چہرے پہ ملے خونِ سحر گذری ہے
خیر ہو مجلسِ اقوام کی سلطانی کی
خیر ہو حق کی، صداقت کی، جہاں بانی کی
اور اونچی ہوئی صحرا میں امیدوں کی صلیب
اور اک قطرۂ خوں چشمِ سحر سے ٹپکا
جب تلک دہر میں قاتل کا نشاں باقی ہے
تم مٹاتے ہی چلے جاؤ نشاں قاتل کے
روز ہو جشنِ شہیدانِ وفا چپ نہ رہو
بار بار آتی ہے مقتل سے صدا چپ نہ رہو، چپ نہ رہو

قطعہ

یہ رقص، رقصِ شرر ہی سہی مگر اے دوست
دِلوں کے ساز پہ رقصِ شرر غنیمت ہے
قریب آؤ ذرا اور بھی قریب آؤ!
کہ رُوح کا سفرِ مختصر غنیمت ہے

گگارن

مُبارک تجھے او زمیں کے مسافر
زمین و زماں کی حدیں توڑ کر
آسمانوں پہ جانا
ہواؤں سے آگے، خلاؤں سے آگے
مہ و کہکشاں کی فضاؤں سے آگے
مُبارک ستاروں کی چلمن ہٹانا
سرِ زلفِ ناہید کو چھُو کے آنا
دلِ ابن آدم کی دھڑکن سنانا
مُبارک تجھے او زمیں کے مُسافر
زمین و زماں کی حدیں توڑ کر
آسمانوں پہ جانا

ہم دونوں

کماری اندرا دھن راج گیر جی کی نظم
BOTH OF US کا آزاد ترجمہ

رات ہے ، باتیں ہیں ، سرگوشی ہے
تُو ہے ، میں ہوں
اپنے گوندھے ہوئے غم کے بندھن
شب کے سناٹے میں
جاگ اُٹھتے ہیں ، تڑپ جلتے ہیں ، چِلّاتے ہیں
دامِ افسون و طلسمات میں پھنس جاتا ہے دِل
جسم اور جان کو کھا جاتا ہے غم

نیشِ غم اور دلِ زار میں پیکار چلی جاتی ہے
گرم گرم آنسو ڈھلک جاتے ہیں رخساروں پر
زندگی یادوں کا مینار بنا لیتی ہے
جو اُڑاتا ہے جہاں میں ابدیت کا مذاق
دیکھتے دیکھتے چپ چاپ بکھر جاتی ہے تاروں بھری رات
چاند چھپ جاتا ہے

رات ہے باتیں ہیں، سرگوشی ہے
تُو ہے، مَیں ہوں
ان پرندوں کی طرح سرگوشی
جو دبی سانس میں گاتے ہیں بچھڑنے کے لیے
گیت، تاروں بھری راتوں میں جسے ہم نے سُنا
دھیمی آواز میں سرگوشی کے انداز میں گایا ہوا گیت
ہاتھ تھرّائے، جدائی کی گھڑی آ پہنچی
ہاتھ میں لے لیے میں نے ترے ہاتھ
تا کہ ان ہاتھوں کو پہچانوں
ان ہاتھوں سے محبّت کر لوں
جسم اور جان کے رشتوں سے بکھر جانے تک
جاوداں شعلۂ جوّالہ کی اک چنگاری

میں نے لے لی ہے ترے ہونٹوں سے
میں جہاں بھی رہوں، جس جا بھی رہوں
اپنی آنکھیں تو اُفق زار دل پہ بلتی ہی رہیں گی کہیں دُور
اور دل چُپکے سے مِل جائیں گے دِل ہی دِل میں
میرے سیلابِ تخیُّل میں تری یاد اے دوست
اس طرح تیَرے گی
صبح دَم تیرتا پھِرتا ہے کسی جھیل میں جیسے کوئی ہنس
ان ہواؤں میں ترے گیت
وہ بکھرے ہوے گیت
گونج اُٹھّیں گے مرے کانوں میں
میرے ہمدم
مِرے دوست!

سنّاٹا

کوئی دھڑکن
نہ کوئی چاپ
نہ سنچل
نہ کوئی موج
نہ ہلچل
نہ کسی سانس کی گرمی
نہ بدن

ایسے سنّاٹے میں اک آدھ تو پتّا کھڑکے
کوئی پگھلا ہوا موتی
کوئی آنسو
کوئی دِل
کچھ بھی نہیں
کِتنی سنسان ہے یہ راہ گذر
کوئی رُخسار تو چمکے، کوئی بجلی تو گرے

وادیِ فردا

راہ میں سرو ملے
راہ میں شمشاد ملے
سب گرفتارِ چمن
شامِ گلمرگ ملی
صبحِ پہل گام ملی
راہ میں ملتے رہے، لالہ و نسرین و سمن
گنگناتے ہوئے پھولوں کے بدن ملتے رہے

دل کی افسردہ کلی
ایسی وادی میں بھی آکر نہ کھِلی
دِل کے خوش ہونے کا سامان
گُل و لالہ نہ نسرین و سمن
جھاڑیاں درد کی
دُکھ کے جنگل
ندّیاں
جن میں بہا کرتے ہیں دِل کے ناسُور
کوہِ غم
ناگ کی مانند
سیہ پھن کھولے
رہ گزر گاہ کو کھا جاتے ہیں
رات ہی رات ہے، سنّاٹا ہی سنّاٹا ہے
کوئی ساحل بھی نہیں
کوئی کنارہ بھی نہیں
کوئی جگنو بھی نہیں
کوئی ستارہ بھی نہیں
میری اس وادیِ فردا کے، او خوش پر طائر!

یہ اندھیرا ہی تری راہ گزر
اس فضا میں کوئی دروازہ نہ دہلیز نہ دَر
تری پرواز ہی بن جاتی ہے سامانِ سفر
دامنِ کوہ میں سوئی نظر آئی ہے
ترے خواب کی زرّیں سحر

لختِ جگر

محبّت کو تم لاکھ پھینک آؤ گہرے کنوئیں میں
مگر ایک آواز پیچھا کرے گی
کبھی چاندنی رات کا گیت بن کر
کبھی گھُپ اندھیرے کی پگلی ہنسی بن کے
پیچھا کرے گی
مگر ایک آواز پیچھا کرے گی
وہ آواز
ناخواستہ طفلکِ بے پدر

ایک دن
سُولیوں کے سہارے
بنی نوعِ انساں کی ہادی بنی
پھر خُدا بن گئی
کوئی ماں
کئی سال پہلے
زمانے کے ڈر سے
سرِ رہگذر
اپنا لختِ جگر چھوڑ آئی
وہ ناخواستہ طفلکِ بے پدر
ایک دن
سولیوں کے سہارے
بنی نوعِ انساں کا ہادی بنا
پھر خدا بن گیا۔

خواہشیں

خواہشیں
لال، پیلی، ہری، چادریں اوڑھ کر
تھرتھراتی، تھرکتی ہوئی جاگ اُٹھیں
جاگ اُٹھی دل کی اِندر سبھا
دل کی نیلم پری، جاگ اُٹھی
دل کی پُکھراج

لیتی ہے انگڑائیاں جام میں
جام میں تیرے ماتھے کا سایہ گرا
گھُل گیا
چاندنی گھُل گئی
تیرے ہونٹوں کی لالی
تری نرمیاں گھُل گئیں
رات کی ان کہی، اَن سُنی داستاں
گھُل گئی جام میں
خواہشیں
لال، پیلی، ہَری، چادریں اوڑھ کر
تھرتھراتی، تھرکتی ہوئی جاگ اُٹھیں

———

وصال

دھنک ٹوٹ کر سیج بنی
جھومر چمکا
سنّاٹے چونکے
آدھی رات کی آنکھ کھُلی
بِرہ کی آنچ کی نِیلی لَو
نَے بنتی ہے
لَے بنتی ہے
شہنائی جلتی روتی تھی
اب سر نیوڑھائے
لال پپوٹے بند کئے بیٹھی ہے
نرم گرم ہاتھوں کی مہندی
ایک نیا سنگیت سُناتی

دل کے کواڑ پہ رُک کر کوئی راتوں میں دستک دیتا تھا
دِل کے کواڑ پہ رُک کر وہ دستک دیتا ہے
پَٹ کھُلتے ہیں
آنکھ سے آنکھ دلوں سے
دِل ملتے ہیں
گھونگٹ میں، جھُومر چھُپتا ہے
گھونگٹ میں، مُکھڑے چھُپتے ہیں
دولت خاں کی ڈیوڑھی کے کھنڈروں میں
بڈّھا ناگ کھڑا روتا ہے
گونگے سنّاٹے بول اُٹھے
گھونگٹ، مُکھڑے، جھُومر، پائل
چمک، دَمک، جھنکار اَمر ہے
پیار اَمر ہے
پیار اَمر ہے
پیار کی رات کی آنکھ اُمڈ آتی ہے
اور دو پھول
تنورِ بدن
شبنم پی کر سوجاتے ہیں

★

ابھی نہ رات کے گیسو کھُلے ، نہ دل مہکا
کہو نسیم سحر سے ، ٹھہر ٹھہر کے چلے

ملے تو بچھڑے ہوے میکدے کے در پہ ملے
نہ آج چاند ہی ڈوبے ، نہ آج رات ڈھلے

نہرو

ہزار رنگ ملے اک سبو کی گردش میں
ہزار پیرہن آئے گئے زمانے میں
مگر وہ صندل و گُل کا غبار، مُشتِ بہار
ہُوا ہے وادیٔ جنّت نِشاں میں آوارہ
ازل کے ہاتھ سے چھُوٹا ہوا حیات کا تیر
وہ شش جہت کا اسیر
نکل گیا ہے بہت دُور جستجُو بن کر

سب کا خواب

وہ شبِ مے ، وہ شبِ مہتاب ، میری ہی نہ تھی
وہ تو سب کا خواب تھا
وہ جو میرا خواب کہلاتا تھا ، میرا ہی نہ تھا
وہ تو سب کا خواب تھا
سایۂ گیسو میں بس جانے کے ارماں دل میں تھے
میرے دل میں ہی نہ تھے
وہ تو سب کا خواب تھا

لاکھ دل ہوتے تھے لیکن
جب دھڑکتے تھے تو اک دل کی طرح
جب مچلتے تھے تو اک دل کی طرح
جب اُچھلتے تھے تو اک دل کی طرح
جب مہک اُٹھتے تو دنیا کا مہک اٹھتا تھا دل
والگا کا، یانگسی کا، نیل کا، گنگا کا دل
آپ میں اک گرمیٔ احساس ہوتی تھی
نہیں معلوم وہ کیا ہو گئی
چاندنی سی میرے دل کے پاس ہوتی تھی
نہیں معلوم وہ کیا ہو گئی

فریاد

کوئی کسی کو بتاتا نہیں، کہ کیا کھویا
کسی کو یاد نہیں ہے، کہ دل پہ کیا گزری
دِلوں میں بند ہیں تلخابۂ حیات کے خُم
کوئی زبان سے کہتا نہیں کہ غم کیا ہے
ہر ایک زخم کے اندر ہے زخم، درد میں درد
کسی کی آنکھ میں کانٹے، کسی کی آنکھ میں پھُول
کہیں گلاب، کہیں کیوڑے کی بستی ہے
یہ سرزمین اِک اِک بُوند کو ترستی ہے

وقت بے درد مسیحا

درد کی رات ہے
چُپ چاپ گزر جانے دو
درد کو مرہم نہ بناؤ
دل کو آواز نہ دو
نورِ سحر کو نہ جگاؤ
زخم سوتے ہیں تو سو رہنے دو
زخم کے ماتھے سے امرت بھری اُنگلی نہ ہٹاؤ
دل کو آرام، پھپولوں کو سکوں ملتا ہے
وقت، بے درد مسیحا ہے
بہ یک حکم، جگا دیتا، جِلا دیتا ہے

قبر سے اُٹھ کے نکل آئی ملاقات کی شام
ہلکا ہلکا سا وہ اُڑتا ہوا گالوں کا گُلال
بھینی بھینی سی وہ خوشبو، کسی پیراہن کی
شب کے سنّاٹے کے جادو نے کمندیں پھینکیں
گوشۂ دل کے کسی چاک میں لیٹی ہوئی
حسرت نے جو انگڑائی لی
خواہشیں، رینگتی پھرتی نظر آتی ہیں کمیں گاہوں میں
کوئی یوسف نہ زُلیخا
یہ وہ محمل ہے
یہ رات
درد کی کاہکشاں ہے کہ صلیبوں کی برات
رات اک ساقیِ بے فیض کے مانند گزرتی ہے
گزر جانے دو
وقت !
او مشفق و محسن قاتل
رات کی نبض میں نشتر رکھ دے
رات کا خون ہے
بہہ جاتا ہے
بہہ جانے دو

نیا سال

کروڑوں برس کی پرانی
کہن سال دنیا
یہ دنیا بھی کیا مسخری ہے
نئے سال کی شال اوڑھے
بہ صد طنز، ہم سب سے یہ کہہ رہی ہے
کہ میں تو "نئی" ہوں
ہنسی آ رہی ہے

—

بِلّور

مُنوّر خموشی کے بِلّور چھنکے
کِرن مرمریں فرش پر چھن سے ٹوٹی
کلی چٹکی ، آواز کے پھول مہکے
رنگوں کی سُروں کی کوئی کہکشاں
کِھلکھلاتی ہوئی گود میں آپڑی
خموشی کے گہرے سمندر کی تہہ سے
کسی جل پَری نے مجھے جیسے آواز دی ہو
اندھیرے کے پردے ہلے ، ساز چونکے
کئی نور کی انگلیاں جگمگائیں
شفق در شفق ، رنگ در رنگ
عارض کا حیرت کدہ سامنے ہے
وہ ہنستا ہوا میکدہ سامنے ہے
دَھنک سامنے ہے
کسی کو یہ قصّہ سناؤں تو کیسے
قدم اور آگے بڑھاؤں تو کیسے

(۴ دسمبر ۶۶ء)

★

جہاں میں جنگ نہیں ، امن سربلند چلے
نسیمِ صُلح چلے ، بادِ تاشقند چلے

○

ایک تھا شخص زمانہ تھا کہ دیوانہ بنا
ایک افسانہ تھا افسانے سے افسانہ بنا
اِک پری چہرہ کہ جس چہرے سے آئینہ بنا
دل کہ آئینہ در آئینہ پری خانہ بنا
خیمۂ شب میں نکل آتا ہے گاہے گاہے
ایک آہو کبھی اپنا کبھی بیگانہ بنا
ہے چراغاں ہی چراغاں سرِ عارض، سرِ جام
رنگِ صد جلوۂ جانانہ صنم خانہ بنا
ایک جھونکا ترے پہلو کا مہکتی ہوئی یاد
ایک لمحہ تری دلداری کا کیا کیا نہ بنا

اپنا شہر

یہ شہر اپنا
عجب شہر ہے کہ
راتوں میں
سڑک پہ چلئے تو
سرگوشیاں سی کرتا ہے
وہ لا کے زخم دکھاتا ہے
رازِ دل کی طرح
دریچے بند
گلی چُپ
نِڈھال دیواریں
کواڑ مُہر بہ لب
گھروں میں میتیں ٹھیری ہوئی ہیں برسوں سے
کرائے پر

جُز ترِی آنکھوں کے

جُز تری آنکھوں کے کِن آنکھوں نے
لُطف کا ہاتھ رکھا درد کی پیشانی پہ
پیار کی آنکھوں سے آنسو پونچھے
ترمیاں
لمحۂ وصل کی مانند
دل وجاں میں اُترتی ہی چلی جاتی ہیں
ہجر کی شام ہے ڈھل جائے گی
وصل کا لمحہ گریزاں ہے پگھل جائے گا

تیرے رخسار کی دہکی ہوئی رنگین شفق
اور بھی سرخ ہوئی
تیرے سلگے ہوئے ہونٹوں کے مہکتے شعلے
اور بھی تیز ہوئے
کب چھلک جائے نہ جانے تری لبریزِ وفا آنکھوں سے
مہر کی مے

کب نکل آئے ترے پیار کا چاند
توڑ دے حلقۂ زنجیرِ شب و روز
کہ یہ سلسلۂ کرب و الم ختم تو ہو
اور ہو جائے جنوں آوارہ
تو مرے حلقۂ آغوش میں آ

درّۂ موت

(ویت نام کے پس منظر میں)

اس تباہی کی گزر گاہ سے چل
یہ کوئی رستہ ہے جس رستے میں
نہ کوئی پھول نہ پتّا
نہ کوئی پیڑ نہ پھل
اک ہیولائے سیہ
حدِّ نظر
جس طرف دیکھو کھنڈر
موت کا درّہ ہے تیزی سے گزر
شام کا چہرہ ہے خوں آلودہ
اور خورشید ہوا، قلزمِ ظلمات میں حل
دشتِ خاموشی سے جب گزرو گے

کئی امیدوں کی لاشوں سے گزرنا ہوگا
اِس اندھیرے سے نِکل
دامنِ کوہ میں چُپ چاپ اُتر آئی ہے رات
اور رستوں سے چمٹ جاتی ہے
سائے مِٹ جاتے ہیں
پھر وہی کرب و کراہ
پھر وہی نالۂ و شیون
وہی چیخیں ، وہی آہ
چیخیں اس زخمیِ گم گشتہ کی
زندگانی نے جسے کاٹ لیا
ایسے اُجڑے ہوے رستے سے ذرا آگے چل

درودِ شوق ، صلوٰۃ و سلام دید نہیں
جو ہے تو اک تپشِ انتظار اب بھی ہے

مارٹن لوتھر کنگ

یہ قتل قتل کسی ایک آدمی کا نہیں
یہ قتل حق کا مساوات کا شرافت کا
یہ قتل علم کا حکمت کا آدمیّت کا
یہ قتل حِلم و مُروت کا خاکساری کا
یہ قتل ظلم رسیدوں کی غم گُساری کا
یہ قتل ایک کا دو کا نہیں ہزار کا ہے
خدا کا قتل ہے قدرت کے شاہکار کا قتل

ہے شامِ شامِ غریباں، ہے صبح صبحِ حُنین
یہ قتل قتلِ مسیحا، یہ قتل قتلِ حُسین

وہ ہاتھ آج بھی موجود و کار فرما ہے
وہ ہاتھ جس نے پلایا کسی کو زہر کا جام
وہ ہاتھ جس نے چڑھایا کسی کو سولی پر
وہ ہاتھ وادیِ سینا میں ویت نام میں ہے
ہر ایک گردنِ مینا ہر ایک جام میں ہے
"کمینہ شرطِ وفا ترکِ سر بود حافظ
برو گزار تو ایں کار بر نمی آید"

رات کے بارہ بجے

رات کے کوئی بارہ بجے ہوں گے
گرمی ہے
سڑکوں پہ کوئی نہیں
بوڑھا درویش بھی جا چکا ہے
اس جذامی بھکارن کی گاڑی
بھی نظروں سے اوجھل ہے
راستہ صاف ہے
ہوٹلوں سے نکلتی ہوئی لڑکیاں ہیں
نہ لڑکوں کے جھرمٹ

منڈیروں پہ
دل ہیں
نہ دل کا دھڑکنا
نہ بھوکی نگاہیں
نہ سیٹی
قہقہے
گردنیں تانے
چشم بر راہ ہیں
کوئی گزرے تو گل ہو کے
ان کا تماشا کریں

دھیرے دھیرے
سرکتے سرکتے
وہ فٹ پاتھ سے
کوئی چکر کی ہریالی پر آ جمے ہیں
چاند نکلا
تو چاروں نے چلّایا
لو چاند نکلا
(سانپ کے مُنہ سے نکلا ہوا جیسے پیلا چھچھوندر)

تو چاروں نے دیکھا کہ
وہ چاند تنہا ہے
اک درد سب کے دلوں میں پگھلنے لگا
ان کی نظروں نے بوسے لیے چاند کے
چاند کی پیٹھ کو تھپتھپایا
بڑے پیار سے
درد سے
جوش و مستی کے عالم میں
شیشے میں جتنی بچی تھی
وہ سب بانٹ کر
قہقہے مار کر
پی گئے
اور گلے مِل کے
اک دوسرے کو بہت دیر تک
چُومتے بھی رہے
قہقہے مارتے مارتے
ناچتے ناچتے
چاروں رونے لگے

ہر ایک کے مُنہ سے نکلا
یارو!
ماں یاد آتی ہے، جاتا ہوں
میں نے تورات و انجیل و قرآن میں
یرمیہ، ہاجرہ اور یعقوب
کے کرب کی داستانیں پڑھی ہیں
ان کا رونا سُنا ہے
اور رویا بھی ہوں
آج بھی رو رہا ہوں

○

گلوئے یزداں میں نوکِ سناں بھی ٹوٹی ہے
کشاکشِ دلِ پیغمبراں بھی ٹوٹی ہے
سراب ہے کہ حقیقت نظارہ ہے کہ فریب
یقیں بھی ٹوٹا ہے، طرزِ گماں بھی ٹوٹی ہے
سیاستِ دل آئینہ چور چور تو تھی
سیاستِ دلِ آہنگراں بھی ٹوٹی ہے
اندھیری رات کا یہ نیم باز سنّاٹا
گلوں کی سانس، رگِ گلستاں بھی ٹوٹی ہے
تمھارے جسم کا سورج جہاں جہاں ٹوٹا
وہیں وہیں مری زنجیرِ جاں بھی ٹوٹی ہے
کہاں ہیں عالَم امکاں وجود میں آئیں
نظر نظر ہی رہی ہے جہاں بھی ٹوٹی ہے
شکست و ریخت زمانے کی خوب ہے مخدومؔ
خودی تو ٹوٹی تھی، خوئے بتاں بھی ٹوٹی ہے

ملاقات

میں آفتاب پی گیا ہوں
سانس اور بڑھ گئی ہے
تشنگی ہی تشنگی
تُو سرزمینِ عطر و نُور سے اُتر کے
آفتاب بن کے آ گئی
بِلور کا جہاز
اَبر سے پرے
رواں ، دواں

اِدھر اندھیری رات ہے
شفق کی تیغِ سُرخ اُس طرف
تمام آسماں
شہاب ہی شہاب ہے
گلال ہی گلال
ستارہ ہم نشیں ہے
ماہ ہم نفس ہے
سازِ جاں نواز ساتھ ہے
گریز پا سفر کا
ایک ایک پل ہے
جاوداں
الٰہی یہ سفر کبھی نہ ختم ہو

غالبؔ

تم جو آجاؤ آج دِلّی میں!
خود کو پاؤ گے اجنبی کی طرح
تم پھرو گے بھٹکتے رستوں میں
ایک بے چہرہ زندگی کی طرح
دن ہے دستِ خسیس کی مانند
رات ہے دامنِ تہی کی طرح
پنجۂ زر گری و زرگیری
عام ہے رسمِ رہزنی کی طرح

آج ہر میکدے میں ہے کہرام
ہر گلی ہے تری گلی کی طرح

وہ زباں جس کا نام ہے اُردو
اُٹھ نہ جائے کہیں خوشی کی طرح

ہم زباں کچھ اِدھر اُدھر سائے
نظر آئیں گے آدمی کی طرح

تم تھے اپنی شکست کی آواز
آج سب چُپ ہیں منصفی کی طرح

آرہی ہے نِدا بہاروں سے
ایک گمنام روشنی کی طرح

اس اندھیرے میں اک روپہلی لکیر
ایک آوازِ حق نبی کی طرح!

واسوخت

تیری دیواروں کے سایوں نے نہیں پہچانا
ایک ایسا بھی زمانہ ہے کہ اب آنے لگا
خوشنما یادوں کے ڈھانچوں سے ملاقات ہوی
چہرہ ٹوٹا ہوا آئینہ نظر آنے لگا
تیری باتیں تھیں کہ پھولوں کی مہکتی چمکار
جی تری باتوں سے کیا بات ہے گھبرانے لگا
گیان سے دھیان سے پوجا تھا کسی صورت کو
آنکھ کھولی تو کوئی اور نظر آنے لگا
دل کے تہہ خانوں میں بارود بچھی ہو جیسے
ایک اِک سانس پہ دل ہے کہ سُلگ جانے لگا
دشت کے پھولوں نے جب پاس بٹھایا ہم کو
عرش ٹوٹا ہوا تارہ سا نظر آنے لگا
اس جنونی کو ذرا دھوپ سے روکو مخدومؔ
چھوڑ کر چھاؤں گلِ تر کی کہاں جانے لگا!

رُت

دل کا سامان اٹھاؤ
جان کو نیلام کرو
اور چلو
درد کا چاند سرِ شام نکل آئے گا
کیا مداوا ہے
چلو درد پیو
چاند کو پیمانہ بناؤ
رُت کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے کالے آنسو
رُت سے کہہ دو
کہ وہ پھر آئے
چلو
اُس گُل اندام کی چاہت میں بھی کیا کیا نہ ہوا
درد پیدا ہوا درماں کوئی پیدا نہ ہوا

○

آمنہ شاہد کی پیدائش کے موقع پر

وہ آرہے ہیں بہاراں کا اہتمام کرو
کلی کلی کو نچھاور نثار جام کرو

○

BISAṬ - E QS

M OOM MOHIUDDIN

Urd Academy, Andhra Pradesh
11-4-637, A. C. GUARDS, HYDERABAD.